تعلیم و تربیت

اپریل 1996ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

پہلا شمارہ

56 واں سال

تعلیم و تربیت

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر عبدالسلام

ایڈیٹر سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر افروز ثاقب

آرٹ ڈائریکٹر / ڈیزائننگ سید شوکت اعجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر ظہیر سلام

پرنٹر عبدالسلام

سرکولیشن و ایڈورٹائزنگ
60- شاہراہ قائداعظم لاہور

سالانہ قیمت
پاکستان میں (بذریعہ رجسٹری) 314/- روپے
مشرق وسطیٰ، افریقہ (ہوائی ڈاک سے) 515/- روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) 715/- روپے
امریکہ، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) 735/- روپے

قیمت فی پرچہ 15 روپے

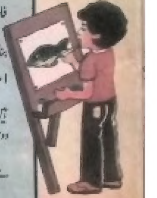

اپریل 1996

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم

اُمید ہے آپ کی عید، اِس ہوش اُڑا دینے والی مہنگائی کے باوجود، اچھی گزری ہوگی اور اب آپ بیتے دنوں کی میٹھی اور سلونی یادوں سے دل بہلا رہے ہوں گے۔

آپ نے مِکی ماؤس اور ڈونلڈ ڈک کی کارٹون فلمیں دیکھی ہوں گی۔ یہ مزے دار فلمیں امریکا کے ایک کارٹونسٹ اور فلم ساز والٹ ڈزنی نے آج سے 30، 40 سال پہلے بنائی تھیں۔ قدرت نے اس شخص کو نہایت اعلیٰ دماغ عطا کیا تھا۔ اس نے 1955ء میں امریکا کے ایک شہر "اینا ہائم" میں ایک بہت بڑی تفریح گاہ قائم کی تھی، جسے ڈزنی لینڈ کہتے ہیں۔ ڈزنی کے اِنتقال کے بعد، اُس کے وارثوں نے 19ء میں، امریکا کے ایک اور شہر "آرلینڈو" میں ڈزنی لینڈ سے بھی بہت بڑی ایک تفریح گاہ بنائی جس کا نام "ڈزنی ورلڈ" ہے۔

پچھلے دنوں آپ کی جانی پہچانی ادیبہ حنا خیری نے ڈزنی ورلڈ کی سیر کی تھی، اور انھوں نے آپ کے لیے اس سیر کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ یہ سیر اتنی دل چسپ اور حیرت انگیز ہے کہ آپ قدم قدم پر اُچھل پڑیں گے اور ایک قسط پڑھنے کے بعد دوسری قسط کا بے چینی سے اِنتظار کریں گے۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
بامتا (کہانی)	سلیم خان گمی	2
ایک لمحے کی غفلت (کہانی)	فوزیہ طاہر	9
فضلو رکشے والا (نظم)	حلیم عیدی	14
اچھا سبق (کہانی)	سیدہ صادقہ بانو	15
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	20
قلم کہاں گئے؟ (کہانی)	عالیہ رحمان بگرامی	21
ماریہ (کہانی)	عبدالستار خان طاہر	27
دل چسپ اور عجیب	س-ل	33
ننھی چڑیا	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	35
ٹیک گیگ (کہانی)	محمد یونس حسرت	37
آئیے مسکرائیں		44
علمی آزمائش		45
آپ بھی لکھیے		47
آپ کا خط ملا		53
باتیں بڑوں کی		56
تیرا میرا پاکستان (نظم)	احمل وجیہ	57
جادو گری	حنا خیری	58
عجائب القدرت کے گوشے)		64

سرورق: ڈزنی ورلڈ کی سیر

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت، 32- شاہراہ بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278815-6278816-7

سلیم خان گبی

مامتا

جب ڈاکٹر حیدر علی آسٹریلیا سے واپس کراچی پہنچے تو میں کراچی کی بندرگاہ پر موجود تھا۔ مجھے جزیرہ "کنگرو" کے صدر مقام سے فیکس کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ ڈاکٹر حیدر علی جو وائرس سے لگنے والی بیماریوں کے مانے ہوئے ڈاکٹر تھے' فلاں تاریخ کو' فلاں وقت' فلاں سمندری جہاز سے بال بچوں سمیت کراچی آ رہے ہیں۔ یہ اطلاع جزیرہ کنگرو کے گورنر کے ایک افسر نے بھجوائی تھی۔ کنگرو' بحرہند میں' آسٹریلیا کا ایک جزیرہ ہے' اور اس کا نام آسٹریلیا کے مشہور جانور کنگرو کے نام پر رکھا گیا ہے۔

میں ڈاکٹر حیدر علی کا سیکرٹری تھا اور کراچی میں رہتا تھا۔ وہ پرائیویٹ ڈاکٹر تھے اور کسی سرکاری ہسپتال سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اُن کا کراچی میں سمندر کے کنارے' اپنا مطب تھا' جس کا نام حیدر کلینک تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کی دن بھر کی مصروفیتوں کو لکھ کر اُن کی میز پر رکھ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کئی دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی میرے ذمے لگا دیتے تھے' یعنی ٹکٹ منگواؤ' فلاں صاحب کو فون کر کے معلوم کرو کہ وہ مشورے کے لئے آئیں گے یا نہیں۔ آج گھر میں مہمان آئیں گے' اور آلو گوشت اور چپاتیوں سے اُن کی تواضع ہو گی۔ بیگم صاحبہ کے دوپٹوں کو رنگوانا ہے۔ اس کا انتظام کرو وغیرہ وغیرہ۔

مجھے فیکس ملا تو میں نے ڈرائیور اکبر بلوچ سے کہا "ڈاکٹر صاحب' بیگم صاحبہ اور ننھا عمران آ رہے ہیں"۔

"بسم اللہ' بسم اللہ" اکبر بولا۔

"اُن کو بندرگاہ سے لانا ہوگا" میں نے اُسے بتایا۔

"بسم اللہ' بسم اللہ"۔

"اُن کے پاس بہت سا سامان ہوگا۔ اُس کا بھی خیال رکھنا"۔

"ضرور' ضرور" اکبر نے جواب دیا۔

"کوئی لوڈر ساتھ لے کر جانا۔ یہ لو 100 روپے۔ ضرورت ہو تو خرچ کرنا ورنہ واپس کر دینا"۔

"نہیں' جناب' نہیں' جناب" وہ ہنس کر بولا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا' اکبر بلوچ؟" میں نے اُسے گھور کر دیکھا۔

"یہ گیا۔ یہ گیا" وہ اور زیادہ ہنس کر بولا۔

"نہیں سمجھا' نہیں سمجھا" میں نے کہا۔

"لوڈر کا کرایہ سو روپے ہوگا۔ ضرورت پڑی تو خرچ کردوں گا 100 کا نوٹ۔ لوڈر کی ضرورت نہ پڑی تو 100 کا نوٹ ہضم" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔ بہرحال' صاحب کو پریشانی نہیں ہونی چاہئے سامان لانے میں۔ وہ بہت سا سامان لے کر آئیں گے۔ کیوں کہ بیگم صاحبہ اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ بہت لالچی خاتون ہیں" میں نے اکبر کو سمجھایا۔

وہ زور سے ہنسا اور بولا "میں بیگم صاحبہ کو بتا دوں گا کہ انور صاحب سیکرٹری نے آپ کو لالچی خاتون کہا تھا"۔

"سو روپیہ تمہارا ہے۔ جو چاہو اُس کا حشر کرو" میں نے کہا اور اکبر بلوچ سے جان چھڑائی۔ اکبر ڈاکٹر حیدر علی کا ڈرائیور تھا' لیکن میرا دوست تھا اور دل کا بہت اچھا آدمی تھا۔

فیلس میں لکھی ہوئی تاریخ پر ہم دونوں کراچی کی بندرگاہ پر گئے۔ جہاز آ چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر صاحب' اُن کی بیگم صاحبہ اور ننھا عمران باہر آئے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کر کے پوچھا:

"سر' سامان کہاں ہے؟"

"گھبراؤ نہیں۔ پیچھے آ رہا ہے" وہ بولے۔

میں نے بیگم صاحبہ کو سلام کیا تو وہ بولیں: گھر کا کباڑا ہو گیا ہوگا' مہینے کے اندر اندر"۔

"نہیں' بیگم صاحبہ۔ گھر پہلے کی طرح ٹھیک ٹھاک ہے۔ بالکل ٹھیک ٹھاک۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ٹھیک ٹھاک ہے" میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"تم تو ٹھیک ٹھاک ہو' انور؟" بیگم صاحبہ نے مجھ سے پوچھا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ بس ننھا عمران بہت یاد آتا تھا" میں نے بتایا۔

"عمران میرے پیچھے کھڑا ہے۔ اُٹھاؤ اُسے" بیگم نے کہا۔

میں نے ننھے عمران کو گود میں اُٹھا لیا۔ اُس کی عمر ڈھائی سال کے لگ بھگ تھی۔ بالکل گورا چٹا بابا تھا۔ میں نے اُس کا منہ ماتھا چوما۔ وہ مجھ سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔

"اداس ہو گیا میرے بغیر" میں نے کہا۔

"بہت بے وقوف بچہ ہے۔ تم تو انسان ہو' اس نے تو کنگرو سے دوستی کر لی تھی"۔

میری سمجھ میں بیگم صاحبہ کی بات نہ آئی اور میں عمران کو پیار کرنے لگا۔ بیگم صاحبہ کار میں بیٹھ گئیں تو ڈاکٹر حیدر علی بولے "اسے اس کی امّاں کو دے دو۔ تم نے اسے چھوڑ دیا تو کسی مچھلی سے دوستی گانٹھ لے گا"۔

میں عمران کو بیگم صاحبہ کے پاس کار میں چھوڑ کر واپس آیا تو ڈاکٹر صاحب کھڑے جہاز کو گھور رہے تھے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کار چل دی۔ گھر کی چابیاں میں نے اکبر بلوچ کو تھما دی تھیں۔

"سر' آپ کیا سامان کا انتظار کر رہے ہیں؟" میں

نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

"ہاں، سامان آ رہا ہے۔ تم کسی ٹرک کا انتظام کرو، ایسا ٹرک جو اوپر سے کھلا ہو" ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

میں نے حیران ہو کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ تو اتنے لالچی نہ تھے کہ اتنا زیادہ سامان آسٹریلیا سے لے آتے۔ البتہ بیگم صاحبہ لالچی تھیں۔ لیکن اتنا سامان؟ ڈاکٹر صاحب نے انہیں کیسے اجازت دے دی؟

جزیرہ کنگرو کے جنگلوں کا فاریسٹ آفیسر ایک پاکستانی سیف خاں تھا اور ڈاکٹر صاحب اُسی کے پاس ٹھہرے تھے۔ کیا اُس نے ڈاکٹر صاحب کو اتنا سامان دیا ہے؟ بہرحال، میں نے کوئی سوال نہ کیا اور ٹرک لانے کے لئے چل پڑا۔

جب میں ٹرک لے کر آیا تو ڈاکٹر حیدر علی اکیلے نہ تھے۔ اُن کے پاس ایک کنگرو کھڑا جُگالی کر رہا تھا۔

"اسے ٹرک میں لدواؤ اور گھر لے چلو" ڈاکٹر صاحب نے حکم دیا۔ میں نے مزدوروں سے، لکڑی کے تختوں کی مدد سے، کنگرو کو ٹرک میں لدوا دیا۔

ہم گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ عمران کی آیا نذیراں کو ہدایات دے رہی تھیں کہ عمران کا فیڈر صاف کرو، چولھے پر پانی گرم کرو، دودھ بھی گرم کرو، بابا سے کہو کہ سبزی گوشت لائے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کنگرو کو کوٹھی کے لان میں ایک درخت سے باندھ دیا تھا اور اب اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی مجھے گھور رہا تھا۔ میری آنکھوں میں حیرت تھی۔ اُس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ دوسرے کنگروؤں کی طرح اُس کے پیٹ میں بھی ایک تھیلا سا تھا، جس میں وہ اپنے بچے کو رکھتا ہوگا۔ میں حیرت سے اُسے دیکھ رہا تھا کہ عمران آ گیا اور کنگرو کے تھیلے میں بیٹھ کر ہنسنے لگا۔ کنگرو نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ زبان سے اُس کا سر چاٹنے لگا۔ دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ میں بھی مسکرانے لگا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر حیدر علی میرے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بولے "دیکھا تم نے؟ دوستی ہو تو ایسی ہو۔ عمران اِس کنگرو کے بغیر نہیں رہ سکتا اور کنگرو عمران کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اسی لئے اِس کو اپنے ساتھ لے آیا ہوں"۔

"لیکن، سر، یہ دوستی ہوئی کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹھو، بتاتا ہوں" ڈاکٹر صاحب بولے اور خود بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فُرصت سے ہیں اور مجھ سے گپ شپ کرنا چاہتے ہیں۔

"تمہیں معلوم ہے کہ میں اپنے ایک پُرانے اور جگری دوست سیف خاں کی دعوت پر آسٹریلیا گیا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے تقاضا کر رہا تھا کہ آسٹریلیا آؤ۔ بہت خوب صورت ملک ہے۔یہاں ہر موسم پایا جاتا ہے اور ہر چیز ملتی ہے۔ لوگ لمبے تڑنگے اور محنتی ہیں۔ خوب محنت کرتے ہیں اور خوب کماتے ہیں۔ یہاں نہ ذات برادری کا جھگڑا ہے، نہ مذہب اور زبان کا۔ نہ غریبی امیری کی باتیں ہیں، نہ سیاسی جھگڑے ہیں۔ سیدھے سادے لوگ ہیں اور سادگی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

"خیر، میں، بیگم صاحبہ اور عمران وہاں گئے۔ ہوائی اڈے پر سیف خاں ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہ ہمیں اپنے جزیرے میں لے گیا۔ یہ جزیرہ آسٹریلیا کے جنوب مشرق کی طرف ہے اور بے حد خوب صورت ہے۔ اُس نے ایک دن کہا "میں چاہتا ہوں آپ یہاں کے جنگل بھی دیکھیں"۔

"آپ کو دیکھ لیا تو جانو جنگل دیکھ لیا" میں نے ہنس کر کہا۔

"آپ مذاق کے موڈ میں ہیں، لیکن میں نہیں ہوں" وہ بولا۔

"آپ ہمیں جنگل کیوں دکھانا چاہتے ہیں؟ اس

لئے کہ ہم آپ کی طرح جنگلی بن جائیں؟" میں نے پھر مذاق کیا۔

"اگر آپ یہ جنگلی والی بات کراچی میں کہتے تو جھگڑا ہو جاتا۔ میں واقعی چاہتا ہوں کہ آپ جنگل دیکھیں اور لطف اٹھائیں" وہ بولا۔

"تمام جنگل ایک سے ہوتے ہیں۔ وہی شیر، وہی چیتے، وہی گیدڑ اور لومڑیاں، وہی ہرن، بارہ سنگے، خرگوش، وغیرہ وغیرہ" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ نے افریقہ کے جنگل دیکھے ہیں۔ لیکن وہاں کنگرو نہ دیکھا ہوگا۔ کنگرو صرف ہمارے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ جانور افریقہ یا اور کسی جنگل میں نہیں ہوتا" سیف خاں بولا۔

"یہ بات تو ٹھیک ہے، سیف خاں" میں نے کہا اور میں جنگل میں جانے کے لئے رضا مند ہوگیا۔

"دوسرے دن میں، میری بیگم، عمران، سیف خاں، اُس کی نوکرانی بشیراں جو اُس کے تین بچوں کی آیا تھی، ایک گائیڈ ڈرل اور سیف خاں کا باڈی گارڈ مارٹن ایک ویگن اور کار میں جنگل کی طرف چل دیئے۔ کار مارٹن چلا رہا تھا اور اُس میں سیف خاں اور میں بیٹھے تھے۔ ویگن میں، میری بیگم، آیا بشیراں اور عمران تھے، اور اسے ڈرل چلا رہا تھا۔ جلد ہم درختوں سے لدے پھندے جنگل میں داخل ہو گئے۔

"جب ہم جنگل میں پہنچے تو ایک پختہ سڑک پر ایک کنگرو گرا پڑا تھا۔ مارٹن نے کار روک لی۔ سیف نیچے اُترا اور کنگرو کو دیکھ کر بولا "یہ زخمی ہے۔ چل نہیں سکتا"۔

"ہم اُس کے اردگرد کھڑے ہو گئے۔ سیف خاں نے ڈرل سے کہا کہ وہ ڈنگر ڈاکٹر یعنی جانوروں کے ڈاکٹر

کو بُلا لائے۔ وہ چلا گیا تو ہم نے زمین پر برساتی بچھائی اور بیٹھ گئے۔ بشیراں چائے تیار کرنے لگی۔

عمران اپنی ماں کے پاس تھا۔ وہ اُن کی گود سے کھسکا اور کنگرو کے پاس چلا گیا جو چند قدم کے فاصلے پر' سڑک کے کنارے پڑا تھا۔ کنگرو نے عمران کو دیکھا تو اپنی زبان باہر نکالی۔ یہ منظر عمران کے لئے عجیب و غریب تھا۔ اُس نے اپنی ننھی مُنّی اُنگلی سے اُس کی زبان کو چھو کر دیکھا۔ وہ لیس دار تھی۔ کنگرو اُسے اپنا بچّہ سمجھ کر اُس کے ہاتھ چاٹتا رہا۔ کچھ دیر بعد عمران واپس آ گیا اور فیڈر سے دودھ پینے لگا۔ ایک گھنٹے بعد ڈنگر ڈاکٹر آ گیا۔ اُس نے زخمی کنگرو کی' جو دراصل مادہ تھی' پوری توجّہ سے مرہم پٹّی کی۔ خون بند ہو گیا تو کنگرو کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اُس کا درد کم ہو گیا تھا۔

"ڈنگر ڈاکٹر چلا گیا تو سیف خاں اپنے مہمانوں کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اُس نے جنگل کے آخری سرے پر بنی ہوئی ایک کُٹیا (ہٹ) میں دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔

"کُٹیا میں پہنچ کر ہم نے نرسری دیکھی' جس میں دنیا جہان کے پودے تھے۔ اِدھر اُدھر رنگ برنگ پرندے اُڑ رہے تھے۔ ہوا میں خوش بو رچی بسی تھی۔ کھانا بھی مزے دار تھا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔ عمران پھولوں کو دیکھتا رہا اور سُونگھتا رہا۔ جب دن ڈھلا تو ہم واپسی کے سفر کی تیّاری کرنے لگے۔

"ہم تیار ہو رہے تھے کہ سیف خاں کو موبائل فون پر اِطّلاع ملی کہ برطانیہ کی مِلکہ' الزبتھ' کو جو دو قیمتی اور نایاب بندر لندن بھجوانا تھے' وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ اُن پر وائرس کا حملہ ہوا ہے اور اُن کے علاج کے لئے جو ٹیکے درکار ہیں وہ یہاں موجود نہیں ہیں۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا" سیف خاں نے کہا۔

"کیا بُرا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"مِلکہ الزبتھ کو دو خاص قسم کے بندر بھجوانا تھے۔ وہ بیمار ہو گئے ہیں۔ اُن پر وائرس کا حملہ ہوا ہے" سیف خاں نے بتایا۔

"اُن کے ٹیکے لگوا دیں۔ ٹھیک ہو جائیں گے" میں نے کہا۔

"ٹیکے ختم ہو چکے ہیں۔ اگر آج نہ لگے تو وہ مر جائیں گے اور حکومت مجھے برخاست کر دے گی کہ میں نے اِحتیاط نہیں کی" سیف خاں بولا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اِتّفاق سے میرے پاس وائرس کے ایک درجن ٹیکے موجود ہیں" میں نے سیف خاں کو بتایا۔

"وہ اِس وقت آپ کے پاس تو نہیں ہوں گے" سیف خاں نے کہا۔

"وہ آپ کے گھر پر ہیں' میرے بیگ میں" میں نے کہا۔

"ہمیں جلد واپس جانا ہوگا" سیف خاں بولا۔

"چلو۔ ویسے اب یہاں کرنا بھی کیا ہے" میں نے کہا۔

"مارٹن' میں اور آپ چلتے ہیں۔ بچّے بعد میں آرام سے آ جائیں گے" سیف خاں نے تجویز پیش کی۔

"بالکل ٹھیک" میں نے کہا۔

"ہم تینوں اُسی وقت روانہ ہو گئے۔ میری بیگم' بشیراں' عمران اور ڈرل پیچھے رہ گئے۔ انہیں ویگن سے آنا تھا' جسے ڈرل چلا رہا تھا۔

"جب ہم اُس جگہ پہنچے جہاں ہم نے زخمی کنگرو کو دیکھا تھا' تو ہماری کار خراب ہو گئی اور مارٹن اُسے ٹھیک کرنے لگا۔ وہاں کنگرو نہ تھا۔ وہ سڑک کے کنارے سے اُٹھ کر جنگل میں چلا گیا تھا' شاید گھاس پات کھانے کے لئے۔ اِتنے میں ڈرل بھی باقی لوگوں کو لے کر آ گیا۔ بیگم نے بشیراں سے کہا کہ وہ فیڈر تیّار کرے' اور پھر عمران کو اُس کے پاس چھوڑ کر وہ بھی ہمارے پاس آ

کر بیٹھ گئیں۔

"کار ٹھیک ہو گئی تو سیف خاں بولا "خدا کا شکر ہے کار ٹھیک ہو گئی۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ مارٹن کار ٹھیک کر سکے گا کیوں کہ وہ گائڈ ہے' کار مکینک نہیں ہے"۔

"مجھے تو کچھ نہیں آتا۔ تیر تُکّے سے کام چلایا ہے۔ خدا نے مدد کی ہے" مارٹن نے کہا اور مجھے اور سیف خاں کو کار میں بٹھا کر چل دیا۔ کیوں کہ ہمیں بہت جلدی تھی۔ بیگم اُٹھ کر بشیراں کے پاس گئیں تو وہاں عمران نہیں تھا۔

"عمران کہاں ہے؟" بیگم نے پوچھا۔

"یہیں تھا' میرے پاس۔ پھر آپ کی طرف چلا گیا تھا" بشیراں نے فیڈر صاف کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں' میرے پاس نہیں آیا" بیگم پریشان ہو کر بولیں۔

"تو پھر اپنے پاپا کے پاس چلا گیا ہوگا" بشیراں نے کہا۔

"اُس کا پاپا تو میرے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ اُس کے پاس آتا تو مجھے پتا چل جاتا"۔

"وہ کار میں گھُس گیا ہوگا" بشیراں بولی۔

"میں نے اُسے کار کے اندر گھُستے ہوئے نہیں دیکھا"۔

"دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا ہوگا"۔

"اگر وہ کسی دروازے سے کار میں گھُستا تو اُس کا پاپا مجھے ضرور بتاتا کہ عمران اُس کے پاس ہے" بیگم نے چیخ کر کہا۔

"بیگم' ڈرل اور بشیراں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عمران کہیں نہ تھا۔ البتّہ سڑک سے کچھ دور' جنگل میں زخمی کنگرو بیٹھا جُگالی کر رہا تھا۔

"اب وہ سب شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بیگم راستے میں دعائیں مانگتی رہیں کہ عمران ہماری کار میں بیٹھ گیا ہو اور سیف خاں کے گھر اُس کے بچّوں کے ساتھ کھیل رہا ہو۔ لیکن جب رات گئے وہ گھر آئے تو عمران وہاں نہ تھا۔

"اُس وقت گھر میں نہ میں تھا اور نہ سیف خاں۔ ہم ملکہ کے بندروں کا علاج کرنے چڑیا گھر گئے ہوئے تھے۔ بیگم نے ٹیلی فون پر رو رو کر عمران کے متعلق بتایا۔

"اُسی وقت میں' مارٹن' ڈرل اور آٹھ دس فاریسٹ گارڈ جنگل کی طرف روانہ ہوئے اور ساری رات ٹارچوں کی مدد سے جنگل کو چھانتے رہے۔ لیکن عمران کا کوئی پتا نہ چلا۔ ہم سب کو یقین ہو گیا کہ اُسے

کوئی درندہ ہڑپ کر گیا ہے۔ میں صدمے سے بے ہوش ہو گیا۔ مارٹن نے مجھے ڈرل کی جیپ میں شہر بھجوا دیا اور خود ایک بار پھر عمران کو تلاش کرنے لگا۔ لیکن اُسے نہ ملنا تھا، نہ ملا۔

"جب صبح ہوئی اور سورج نکلا تو مارٹن اور اُس کے ساتھی اُسی جگہ آکر بیٹھ گئے جہاں ہمیں زخمی کنگرو ملا تھا اور جہاں ہماری کار خراب ہوئی تھی۔ مارٹن کی حالت بہت بُری تھی۔ اُس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا کرے۔

"اِسی حالت میں اُس نے ہرے بھرے جنگل کو گھورنا شروع کیا۔ وہ گائڈ تھا اور سیف خاں اُسے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتا تھا۔ سیف خاں کیا کہے گا کہ وہ اُس کے مہمان کے بچّے کو تلاش نہ کر سکا۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دور کچھ فاصلے پر اُسے ایک کنگرو نظر آیا۔ وہ سمجھا کہ شاید اُس کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ لیکن وہ کنگرو ہی تھا۔

"وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کنگرو کے پاس گیا۔ کنگرو نے اُسے دیکھ کر گھاس چرنا بند کر دیا اور اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ وہی زخمی کنگرو تھا۔ مارٹن نے جھک کر اس کی زخمی ٹانگ کو دیکھنا چاہا تو اس نے دیکھا کہ کنگرو کے پیٹ میں سے دو ننھے ننھے ہاتھ باہر آئے ہیں۔ اِس کے بعد کسی کا سر نکلا اور پھر چہرہ۔ یہ چہرہ عمران کا تھا اور وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا۔ صبح ہو گئی تھی اور عمران نیند سے جاگ رہا تھا۔ وہ ساری رات کنگرو کے پیٹ کی نرم گرم تھیلی میں سویا رہا تھا۔

جب مارٹن عمران کو لے کر شہر پہنچا تو اُس کے ساتھ کنگرو بھی تھا۔ اُسی کنگرو کو میں ساتھ لے کر کراچی آیا ہوں اور وہ مجھے عمران کی طرح عزیز ہے"۔

جاوید میاں داد

○ جاوید میاں داد نے پہلا ٹیسٹ میچ، 1976ء میں، لاہور میں، نیوزی لینڈ کے خلاف، کھیلا تھا۔ اُس وقت پاکستان کے اِس قابلِ فخر کھلاڑی کی عمر 18 سال تھی۔

○ انھوں نے 124 ٹیسٹ میچ کھیلے، جن میں 8,832 رن بنائے۔ رنوں کی تعداد کے لحاظ سے ان کا، کرکٹ کی تاریخ میں، (آسٹریلیا کے ایلن بورڈر اور بھارت کے سنیل گواسکر کے بعد) تیسرا نمبر ہے۔

○ میاں داد نے 233 ون ڈے اِنٹرنیشنل میچوں میں حصّہ لیا، اور 7392 رن بنائے۔

○ میاں داد واحد کھلاڑی ہیں، جنھوں نے ورلڈ کپ کے تمام مقابلوں (6) میں حصّہ لیا۔ انھوں نے ان مقابلوں میں، 43.54 کی اوسط سے 1,094 رن بنائے۔ اور کوئی کھلاڑی اتنے رن نہیں بنا سکا۔

○ میاں داد نے پانچویں ورلڈکپ ٹورنامنٹ میں صحت خراب ہونے کے باوجود، حصّہ لیا اور تمام کھلاڑیوں سے زیادہ اِسکور کیا۔ یہ ورلڈ کپ، 1992ء میں، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ہوا تھا اور اِس میں، میاں داد کی دھواں دھار بیٹنگ کی وجہ سے، پاکستان نے فتح حاصل کی تھی۔

○ میاں داد پچھلے دو سال سے کرکٹ نہیں کھیل رہے تھے۔ انھیں چھٹے ورلڈ کپ کے موقع پر پاکستانی ٹیم میں شامل کیا گیا۔

○ 9 مارچ 1996ء کو، بھارت کے شہر بنگلور میں بھارتی ٹیم کے ہاتھوں پاکستانی ٹیم کی شکست کے بعد، جاوید میاں داد نے اِنٹرنیشنل کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔

○ پاکستانی کرکٹ کی تاریخ میں، اے آر کاردار، ظہیر عبّاس، حنیف محمد اور عمران خان کے ساتھ، جاوید میاں داد کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا، اور کرکٹ کے شائقین اِس مایہ ناز پاکستانی کھلاڑی کا نام ہمیشہ عزّت و احترام سے لیں گے۔

ایک لمحے کی غفلت

فوزیہ طاہرہ

عدنان اور ارسلان جلد سے جلد تھانے پہنچنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اُن کے ہاں بھی ڈاکو آسکتے ہیں۔ ڈی ایس پی اسلم بھٹی اور اُن کے بیٹے اِنسپکٹر وقار کے گھر کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھے، بھلا یہ کیسے ممکن تھا۔

"تیز تیز قدم اُٹھاؤ" ارسلان نے فیضی کا ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"عدی بھیّا، مجھے تو ڈر لگ رہا ہے" عائشہ اپنے بڑے بھائی عدنان کی طرف دیکھ کر معصومیت سے بولی۔

"تم سے کس نے کہا تھا کہ ہمارے ساتھ آؤ" عدنان نے اپنے بڑے پن کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بڑے رُعب سے کہا۔

گھر سے تھانے کا فاصلہ 200 گز سے زیادہ نہ تھا۔ عدنان اور ارسلان ایک مرتبہ پہلے بھی اپنے مونی چاچو کے ساتھ اپنے دادا ابّو کے پاس تھانے آئے تھے۔ تب سے اُنھیں راستہ یاد تھا۔ ارسلان کی تجویز تھی کہ حُمیرا پھوپھو کے گھر جا کر اِطّلاع دینے سے بہتر ہے کہ وہ تھانے جائیں تاکہ ڈاکوؤں کو رنگے ہاتھوں پکڑا جا سکے۔

"ہائے! میرا وی سی آر۔ اب ہم فلمیں کیسے دیکھیں گے؟" عائشہ نے بُرا سا مُنہ بناتے ہوئے فیضی سے کہا۔

"وہ تو تی وی بھی لے دائیں گے، عدی بھیّا" فیضی نے توتلی زبان میں کہا۔

"ارے! وہ دیکھو۔ مونی چاچو۔ اور..... اور اِحسان بھیّا" عاشی نے اپنے دائیں جانب اِشارہ کرتے ہوئے چِلّا کر کہا۔

سب بچّے مونی چاچو، مونی چاچو کہتے ہوئے اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ مونی چاچو سب بچّوں کے پسندیدہ چچا تھے۔ اصل نام تو اُن کا مُنیب جاوید تھا، لیکن انھیں گھر میں سب مونی کہتے تھے۔ وہ بھی اپنے بھتیجوں بھانجوں سے بہت محبّت کرتے تھے۔ بچّوں کو یہاں دیکھ کر وہ حیران تھے۔ کیوں کہ ایک گھنٹا پہلے سب گھر والے حمیرا باجی کے ہاں دعوت پر گئے تھے۔ پھر بھلا اِن بچّوں کا یہاں کیا کام! اس سے پہلے کہ وہ بچّوں سے کوئی سوال کرتے، عاشی اور فیضی نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

"کچھ پتا تو چلے کہ ہوا کیا ہے" مُنیب چچا نے ارسلان سے پوچھا اور ارسلان اور عدنان نے ایک ہی سانس میں ساری کہانی سُنا ڈالی۔

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ 15 مِنٹ پہلے تک تو میں خود گھر میں تھا۔ تم لوگوں کو غلطی لگی ہے۔ بھلا ڈاکو اور ہمارے گھر؟" مُنیب چچا نے بچّوں کی بات مذاق میں اُڑاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"نہیں، مونی چاچو--- میں نے اور فیضی نے خود

کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر سُنا تھا۔ ایک ڈاکو کمرے کے اندر کہہ رہا تھا کہ ہم سارا سامان لے جائیں گے۔ جلدی کرو، جلدی" عاشی نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ فیضی بھی سر ہلا ہلا کر اُس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

"لیکن تم گھر واپس آئے کیوں تھے؟"

"ہم اپنی وڈیو گیم بھول گئے تھے۔ فضل رازق بھیا کہنے لگے کہ گھر دور ہی کتنا ہے۔ جاؤ، لے آؤ۔ بس ہم چپکے سے کھسک آئے" عدنان نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"گھر چل کر پہلے میں خود دیکھتا ہوں، پھر تھانے چلیں گے"۔

منیب چچا کی یہ بات سُن کر بچّے اِصرار کرنے لگے کہ وقت ضائع کرنے کی بجائے تھانے ہی چلنا چاہئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکو سب سامان لے کر فرار ہو جائیں۔ بچّوں کی ضد کے آگے آخر منیب چچا کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ بھی چاروں بچّوں کے ساتھ تھانے چل دیئے تاکہ اپنے والد سے اِس سلسلے میں بات کی جا سکے۔

ڈی ایس پی اسلم بھٹی نے اپنے پوتوں کو تھانے میں داخل ہوتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ لیکن منیب چچا کے بتانے پر اُن کا ماتھا بھی ٹھنکا۔ انہوں نے فوراً چند سپاہیوں کو ساتھ لیا، گاڑی میں بیٹھے اور اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ ڈی ایس پی اسلم بھٹی کا نام شہر کے بدمعاشوں کے لئے نیا نہ تھا۔ انہوں نے پچھلے دنوں دارا پہلوان کو ایسا سبق سکھایا تھا کہ وہ آج تک نظریں جُھکا کر چلتا ہے۔

آن کی آن میں پولیس نے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ پولیس کو دیکھ کر محلّے والے بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔ گھر کے اندر بتّیاں روشن تھیں اور کھڑکی کے راستے روشنی چھَن چھَن کر باہر آ رہی تھی۔ اِس سے اسلم بھٹی کو بھی یقین ہو گیا کہ اندر کوئی ہے۔ ورنہ گھر والوں کی غیر موجودگی میں بتّیاں کیسے روشن ہو سکتی تھیں! چار سپاہی پڑوس کے گھر کی دیوار پھلانگ کر پہلی منزل کی بالکنی پر اُتر گئے۔ باقی سپاہیوں نے گھر کو گھیر رکھا تھا۔ عدنان اور ارسلان فیضی اور عائشہ کو لے کر منیب چچا کی اوٹ میں کھڑے تھے۔

"سوئی چاچو، ڈاکو کی شکل کیسی ہوتی ہے؟" عاشی نے آہستہ سے اپنے چچا سے پوچھا۔ اِس سے پہلے کہ منیب چچا جواب دیتے، فیضی غصّے سے بول پڑا "بالکل تمہارے جیسی"۔

"اوہو! بھئی، یہ جھگڑنے کا وقت نہیں ہے۔ ابھی دیکھ لینا کہ ڈاکو کیسے ہوتے ہیں" منیب چچا نے کہا۔

"ڈی ایس پی اسلم بھٹی نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ڈاکوؤں کو خبردار کیا کہ 10 منٹ کے اندر اندر باہر آ جائیں، ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔ 10 منٹ کا وقفہ گزر چکا تھا، لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا تھا۔ کانسٹیبل ہدایت خان نے دروازہ توڑنے کی اجازت چاہی لیکن ڈی ایس پی نے اُسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

ایک بار پھر لاؤڈ اسپیکر پر اِعلان کیا گیا، لیکن گھر کے اندر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ البتّہ کسی کسی لمحے ہلکی ہلکی سرگوشی کی آوازیں سُنائی دیتیں۔ کبھی کھٹ کھٹ کی آواز آتی تو کبھی کسی کے کھانسنے کی آواز محسوس ہوتی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ڈی ایس پی اسلم بھٹی کا غصّہ آسمان کو چھوتا جا رہا تھا۔ آخر انہوں نے طے کیا کہ اب زیادہ اِنتظار فضول ہے۔ کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہوا جائے تاکہ ڈاکوؤں کو زندہ حالت میں گرفتار کیا جا سکے۔

منیب چچا نے کھڑکی کے قریب جا کر اُس کی درزوں سے اندر جھانک کر دیکھا۔ لیکن کھڑکی کے آگے پردے پڑے ہوئے تھے، اِس لئے کچھ دکھائی نہ دیا۔

اُن کی بہن مُنیرا کے ہاں گئے تھے جو دو گھڑیاں پرے رہتی تھیں۔ منیب چاچو کو اِنٹرویو کی تیاری کرنی تھی۔ اِس لئے وہ اُن کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ حال ہی میں اُنہوں نے ایم اے کا اِمتحان پاس کیا تھا اور لیکچرر شپ کے لئے تحریری ٹیسٹ تو پاس کر لیا تھا' اب اگلے دن انٹرویو تھا۔ پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتائی تو مغرب سے ذرا پہلے وہ اپنے دوست خاور کے ہاں چلے گئے۔ خاور گھر پر نہ ملا تو اُنہیں واپس آنا پڑا اور یوں راستے میں بچوں سے مُڈبھیڑ ہو گئی۔

منیب چاچو نے جیب سے چابی نکالی اور دروازہ کھول کر اندر جانے لگے۔ اُن کے والد ڈی ایس پی اسلم بھٹی نے انہیں یوں بے دھڑک ڈاکوؤں کے نرغے میں جانے سے روکنا چاہا' لیکن وہ بجلی کی سی تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ اسلم بھٹی کو اپنے بیٹے کی اِس نادانی پر بُہت غصّہ آیا' کیوں کہ بغیر کسی ہتھیار کے ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنا کوئی عقل مندی کی بات نہ تھی۔

اِنسپکٹر وقار بھی اِطّلاع ملتے ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ بھی حیران تھے کہ اُن کا چھوٹا بھائی پولیس کے ہوتے ہوئے اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈال رہا ہے! انہوں نے چلّا کر کہا "منیب!..... منیب!..... رُک جاؤ۔ آگے مت جاؤ"۔

"مونی چاچو! مونی چاچو! خدا کے لئے مونی چاچو کو اندر جانے سے روکیں" بچے بھی منیب چچا کو اندر جانے سے روک رہے تھے۔ اُنہیں ڈر تھا کہ ڈاکو اُنہیں کوئی نُقصان نہ پہنچا دیں۔ آخر اِنسپکٹر وقار نے پولیس کو گھر پر دھاوا بولنے کا اِشارہ کیا۔

منیب چاچو کاریڈور سے ہوتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اگرچہ اُن کا دل آنے والے کسی خطرے سے خوف زدہ تھا' لیکن اُنہیں کافی حد تک اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ آوازیں رُکن کی ہو سکتی ہیں۔ بچے

البتّہ کانوں میں باتوں کی آوازیں آ رہی تھی۔ اُنہوں نے یہ آوازیں پہچاننے کی کوشش کی۔ ایک دو آوازیں کچھ کچھ جانی پہچانی سی لگیں۔ انہوں نے کانسٹیبل ہدایت خان اور اپنے والد کو چُپ رہنے کا اِشارہ کیا۔ اِسی دوران میں اُن آوازوں کے درمیان ایک زور دار میوزک بھی بجا۔

"ارے! میوزک..... اور..... ڈاکو؟" منیب چچا کے کان کھڑے ہو گئے۔

اِس سے پہلے کہ کانسٹیبل ہدایت خان کھڑکی توڑ کر اندر جانے کی کوشش کرتا' منیب چچا کو یاد آیا کہ اُن کی جیب میں گھر کی چابی جو موجود ہے۔ پھر کھڑکی کس لئے توڑی جائے۔ سب گھر والے رات کے کھانے پر

ہوئے سب گلی میں اپنی اپنی جگہ سے کھڑے تھے۔

"کاش میاں اسمٰعیل چاچا تو واکو پکڑ نہ لے" لیلیٰ نے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے کہا۔

عدنان اور ارسلان کو آیت کرسی یاد تھی۔ وہ دونوں دل ہی دل میں پڑھنے لگے۔ انہوں نے اب تک قصوں اور ڈراموں میں ڈاکوؤں کو دیکھا تھا۔ آج سچ مچ ان کے ہاں ڈاکو آ جائیں گے' یہ تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ثمیرا باجی نے فضل رازق کو معولی چاچا کی طرف یہ معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا کہ بچے ابھی تک واپس کیوں نہیں آئے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ گھر سے باہر سینکڑوں لوگ جمع تھے' اور انتظار کر رہے تھے کہ ابھی ٹھاہ ٹھاہ کی آوازیں آئیں گی اور سارے ڈاکو ڈھیر ہو جائیں گے۔

"میرے معولی چاچا بڑے بہادر ہیں۔ دیکھا' اکیلے ہی اندر چلے گئے۔ ہاں" ماشی نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر کہا۔

"اللہ کرے یہ ڈاکو مر جائیں۔ آج ہم ننھا ڈرامہ بھی نہ دیکھ سکے" عدنان نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ اس عرصے میں پولیس کے مزید سپاہی آ گئے تھے اور دروازہ کھلا دیکھ کر اندر داخل ہو گئے تھے۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دی جائے گی" ایک اور بھاری آواز آئی اور پھر زور سے میوزک بجا۔

اگرچہ منیب چاچا کو سو فی صد یقین ہو چکا تھا کہ یہ سرگوشیاں اور آوازیں ان کی جانی پہچانی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف گئے۔ اور پھر وہی ہوا' جس کا انہیں یقین تھا۔ ٹی وی پر ڈراما چل رہا تھا اور ایک جانا پہچانا ایکٹر کسی دوسرے ایکٹر کو زور زور سے دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس دوران میں ڈی ایس پی اسلم بھٹی اور انسپکٹر وقار کے علاوہ باقی پولیس والے بھی یہ منظر دیکھ چکے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ گھر کی بتیاں روشن کرنے والا کون ہے اور ٹی وی کس نے لگایا۔ اس لئے سب لوگ بہت احتیاط سے گھر کے ایک ایک کمرے کو چیک کرنے لگے۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ منیب چاچا نے جلدی سے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے ان کی بھابی کی آواز آئی۔ وہ ثمیرا کے گھر سے بول رہی تھیں۔

"بھابی!..... خیریت؟" منیب چاچا نے پوچھا۔ پھر ایک دم اچھل کر بولے:

"کیا؟ لوڈشیڈنگ تھی۔ سوئچ آف کرنا بھول گئیں؟..... بجلی کی استری بھی؟ اوہ! میرے خدا!"

منیب چاچا نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور کریڈل پر رکھا اور ڈرائنگ روم کی جانب دوڑتے ہوئے گئے' جہاں

بجلی کی استری سے ہلکا ہلکا دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے پلگ نکالا۔ اگر ذرا اور دیر ہو جاتی تو گھر کو آگ لگ سکتی تھی۔

ڈی ایس پی صاحب کی سمجھ میں نہ آیا کہ اُن کی بہو نے فون پر کیا کہا ہے۔ مُنیب چاچو اب سارا معاملہ سمجھ چکے تھے۔ یہ تو شکر ہُوا کہ اچھے وقت پر اُن کی بھابی کا فون آ گیا، جنہوں نے بتایا کہ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے گھر کی بتیاں غلطی سے آن رہ گئی تھیں۔ ٹی وی جس پر بچے فلم دیکھ رہے تھے، وہ بھی آن تھا۔ گھر کی مُلازمہ کو بھی، جو کپڑے اِستری کر رہی تھی، پلگ نکالنا یاد نہ رہا۔ بھابی کو جیسے ہی یاد آیا، انہوں نے فون کر کے انہیں آگاہ کر دیا۔ مُنیب چچا کی زبانی یہ کہانی سُن کر سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

اب بچے بھی اندر آ چکے تھے۔ فیضی جس کی نظریں رسّیوں سے جکڑے ڈاکوؤں کو تلاش کر رہی تھیں، سونی چاچو کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"فیضی! عائشہ! ذرا اِدھر آنا۔ ڈاکوؤں کی آوازیں کس کس نے سُنی تھیں؟" مُنیب چچا نے دونوں کے کان پکڑتے ہوئے پوچھا۔

اب فیضی اور عائشہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آ چکی تھی کہ کھڑکی کے باہر جو آوازیں انہوں نے سُنی تھیں، وہ ٹی وی کے کسی ڈرامے یا ٹیلی فلم کی ہوں گی۔ ظاہر ہے جب گھر والوں کے جانے کے بعد بجلی آئی ہو گی تو اپنے آپ گھر کی بتیاں بھی روشن ہو گئی ہوں گی، ٹی وی بھی آن ہو گیا ہو گا اور اِسی طرح استری بھی گرم ہونے لگی ہو گی۔ ایک لمحے کی غفلت سے نہ صرف سب کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ پولیس کا وقت بھی ضائع ہوا۔

"سر، خدا کا شکر کریں کہ اِن بچوں کی وجہ سے آپ کا گھر ایک بڑے حادثے سے بچ گیا" کانسٹیبل ہدایت خان نے اِنسپکٹر وقار سے کہا۔

"اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ اگر یہ بچے ٹی وی کی وجہ سے غلط فہمی میں نہ پڑتے تو خدا جانے بجلی کی اِستری کی وجہ سے ہم کتنی بڑی مصیبت سے دو چار ہو جاتے" ڈی ایس پی اسلم بھٹی نے اپنے پوتوں اور پوتی کی جانب پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا اِنعام، دادا ابّو؟" سب بچّے خوشی سے چلّا اٹھے۔

"ضرور ملے گا، ضرور ملے گا۔ اور تمہارے سونی چاچو کو بھی اِنعام ملے گا" اسلم بھٹی نے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔

رکشے والا

ضیغم حمیدی

یہ ہے فضلو رکشے والا
دن بھر محنت کرنے والا
اُٹھ جاتا ہے صبح سویرے
سڑکوں کے کرنے کو پھیرے
تھوڑی سی ورزش کرتا ہے
محنت اور کوشش کرتا ہے
پہلے رکشے کو دھوتا ہے
دیکھ کے اُس کو خوش ہوتا ہے
اچھی طرح کر کے تیاری
چھوڑ کے سُستی اور بیزاری
رکشہ سڑک پر لے کر آئے
خود یہ محنت کر کے کھائے
اس کو سواری جب ملتی ہے
خوب کلی دِل کی کھلتی ہے
مانا اَن پڑھ اور جاہل ہے
پھر بھی یہ کتنا عاقل ہے
یہ ہے فضلو رکشے والا
دن بھر محنت کرنے والا

"امّی جان' امّی جان' پلیز آپ ابّو سے کہیں کہ آج شام دفتر سے واپسی پر بکرا ضرور لیتے آئیں" نعمان نے امّی سے کہا۔

"ارے واہ! کیوں لیتے آئیں اِتنی جلدی؟" امّی نے نُعمان کو غصّے سے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

"وہ' امّی جان' دیکھئے ناں' ہمارے محلّے میں سب کے گھر بکرے آ چکے ہیں۔ میرے سارے دوست شام کو اپنے اپنے بکروں کو گلی محلّے میں ٹہلاتے ہیں اور ایک میں ہی ہوں جو خالی ہاتھ اُن کے ساتھ ایسے ہی پھرتا رہتا ہوں" نعمان نے مُنہ بسورتے ہوئے بتایا۔

"امّی جان' ابّو جان نے اچھّا ہی کیا جو بکرا نہیں لائے ورنہ تو نعمان بھائی جان اب تک اُس کا نہ معلوم کیا حشر کر چکے ہوتے" نعمان کا چھوٹا بھائی عمران کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"ہائیں! یہ میں کیا سُن رہی ہوں' نُعمان بیٹا؟" امّی نے نعمان سے پوچھا۔

"نہیں امّی جان' ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ عمران جھوٹ بول رہا ہے..... جھوٹا کہیں کا" نعمان نے تیزی سے کہا اور عمران کے ایک مُکّا بھی جڑ دیا۔ اُس نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"نعمان! بہت بُری بات۔ پہلے بھی میں تمہیں مار پیٹ کرنے سے منع کر چکی ہوں" امّی نے سخت لہجے میں کہا۔ "ٹھہرو! میں ابھی تمہارے کان کھینچتی ہوں"۔

وہ نعمان کی طرف بڑھیں تو وہ جلدی سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ابّو جان اور امّی جان دونوں ہی نُعمان اور عمران سے بہت محبّت کرتے تھے۔ نعمان چُوں کہ بڑا تھا' اِس لئے اُسے بہت سمجھ دار اور ذہین ہونا چاہئے تھا تاکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی عمران کو بُرے کاموں سے روک سکتا۔ مگر یہاں تو مُعاملہ ہی اُلٹ تھا۔ نعمان حد درجہ شریر اور بدتمیز تھا۔ پڑھنے لکھنے میں تو اُس کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔ ہر وقت کھیل کود کی فکر ہی اُس کے سر پر سوار رہتی تھی۔ لڑکوں سے لڑنا جھگڑنا' بُزرگوں سے

بدتمیزی سے پیش آنا اور جانوروں کو تنگ کرنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔

اس کے برخلاف عمران نہایت ہی نیک اور تمیز دار بچّہ تھا۔ نہ تو وہ کسی سے لڑتا جھگڑتا تھا اور نہ کسی سے بدتمیزی کرتا تھا، اور جانوروں، پرندوں، پھول پودوں سے تو اُسے بہت ہی محبّت تھی۔ ابّو جان نے اُس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اُسے چھوٹے چھوٹے گملے لا دیئے تھے جن میں پھولوں سے لدے خوب صورت پودے تھے۔ عمران بہت شوق سے اپنے پودوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ مگر ہوتا یہ کہ عمران کی نظر بچا کر نعمان کبھی سارے پھول توڑ کر پتّی پتّی کر کے بکھیر دیتا۔ کبھی کسی پودے کی ٹہنیاں توڑ ڈالتا اور کبھی پودے کے تنے کو زور زور سے ہلا کر اس کی جڑوں کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا۔ عمران بے چارہ لڑائی جھگڑے کا عادی نہ تھا، اِس لئے وہ نعمان کی شرارتوں کے جواب میں خاموش رہتا۔ لیکن جب بھی اُسے موقع ملتا، وہ اپنے بڑے بھائی کو سمجھانے کی کوشش ضرور کرتا۔

عمران نے ایک بلّی پال رکھی تھی اور نعمان دل و جان سے اُس بلّی کا دشمن تھا۔ اُسے جب بھی موقع ملتا، اسے غلّہ مار کر زخمی کر دیتا یا پھر اُس کی دم کھینچنے لگتا۔ یہ بلّی جسے عمران مانو کہتا تھا، اُسے زخمی حالت میں راستے میں پڑی ملی تھی اور وہ اُسے اُٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ اُس نے بلّی کے زخم صاف کر کے نہ صرف اس کی مرہم پٹی کی بلکہ اسے دودھ بھی پلایا۔ بس وہ دن اور آج کا دن، بلّی اُسی گھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ نعمان پر نظر پڑتے ہی وہ چھلانگ مار کر کہیں غائب ہو جاتی۔

نُعمان کی شرارتوں سے اِنسان تو اِنسان جانور تک پریشان تھے۔ اب یہ شب برات ہی کی بات ہے، گلی میں دوپہر کے وقت ایک کتّا سو رہا تھا کہ نعمان اور اس کے دوستوں کو شرارت سوجھی تو اُنھوں نے کتّے کی دُم میں پھلجھڑی باندھ کر اُسے آگ لگا دی۔ بے چارہ کتّا ہڑبڑا کر اٹھا اور چیختا ہوا بھاگا۔ بچّے ہاتھ میں پتھر لئے اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ کتّا اپنی دُم سے بندھی پھلجھڑی کو جلتے دیکھ کر شاید یہ سمجھا کہ اُس کی دُم میں آگ لگ گئی ہے۔ اُس نے بچّوں کے پتھروں سے بچنے اور اپنی دُم میں لگی آگ بجھانے کے لئے نالے میں چھلانگ لگا دی۔ نالے میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ وہ بے چارہ ڈوب کر مر گیا۔

نعمان کی اِس شرارت کی خبر عمران کو بھی ہو گئی تھی اور اسے بہُت افسوس ہوا تھا۔ بے چارے معصوم، بے زبان جانور بھائی جان کو کتنی بد دعائیں دیتے ہوں گے۔ اور دادا جان تو کہتے ہیں کہ بددعا قبول ہو جائے تو پھر بڑی سخت سزا ملتی ہے۔ عمران نے بڑے دُکھ سے سوچا تھا۔ اِس کے علاوہ وہ اور کر ہی کیا سکتا تھا۔ نعمان کی شرارتوں سے تو وہ خود بھی بہت پریشان تھا۔ وہ نعمان کو سمجھانے کی کوشش کرتا تھا مگر اِس کا اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔ نعمان اُس کی بات ایک کان سے سُن کر دوسرے کان سے اُڑا دیا کرتا اور عمران ہاتھ مل کر رہ جاتا۔

"ابّو جان بکرے لے آئے! ابّو جان بکرے لے آئے!" شام کو جیسے ہی ابّو گھر میں داخل ہوئے بکروں کی مَیں مَیں نے سب کو بتا دیا کہ وہ بکرے لے آئے ہیں۔ نعمان خوشی سے چیختا ہوا صحن میں نکل آیا۔ خوش تو عمران بھی بہت تھا۔ ابو جان دو صحت مند بکروں کی رسی تھامے کھڑے تھے۔

"یہ میرا ہے" نُعمان نے لپک کر سفید اور کالے رنگ کے بکرے کی رسّی پکڑ لی۔

عمران نے بھورے رنگ کے بکرے کی رسّی تھام لی۔

"ابّو جان' میں بکرے کو شلانے لے جا رہا ہوں" نعمان کو تو باہر جانے کی جلدی تھی۔

"ارے' ایسی بھی کیا جلدی۔ پہلے بکرے کو چارا تو کھلا دو" ابو نے کہا۔

"ابّو جان' باہر ہی کھلا دوں گا"۔ نعمان اور کچھ سُننے کو تیار نہ تھا۔ اُس نے بکرے کی رسّی پکڑی اور بھاگ کھڑا ہوا۔

"عمران بیٹا' تم بھی بکرے کو شلا لاؤ" ابّو جان نے کہا۔

"نہیں' ابّو جان۔ آج نہیں' کل لے جاؤں گا" عمران نے جواب دیا۔ ابّو جان خاموش ہو گئے۔ عمران کا دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ بکرے کے ساتھ باہر گلی میں گھومے پھرے مگر نعمان کے خوف سے وہ گھر میں ہی بیٹھا رہا۔ اسے پتا تھا کہ اگر وہ بکرے کو لے کر باہر نکلا تو نعمان اور اس کے شرارتی دوست اُس کے بکرے کے پیچھے پڑ جائیں گے۔

نعمان اور اُس کے دوست دن بھر بکروں کو سڑک پر بھگاتے تھے' اور جو بکرا تیز نہ بھاگتا اُس کو چھڑی سے مارتے تھے۔

"بھائی جان' یہ بہت بُری بات ہے۔ دادا جان نے بتایا تھا کہ جانوروں کو' خصوصاً قربانی کے جانوروں کو بہت پیار محبّت سے رکھنا چاہیے" عمران نے نعمان کو سمجھایا۔

"ہُونہہ! سب پتا ہے مجھے' اور میں بکرے کو خواہ مخواہ تھوڑی مارتا ہوں۔ وہ تو ہم بکروں کی ریس لگاتے ہیں۔ ظاہر ہے جب میرا بکرا تیز نہیں بھاگے گا تو اُسے تیز تیز بھگانا تو پڑے گا ناں" نعمان نے جواب دیا۔

"مگر یہ غلط ہے" عمران نے کہا۔

"غلط ہے تو غلط ہی سہی۔ تمہیں اِس سے کیا؟" نُعمان نے غصّے سے جواب دیا اور اُٹھ کر چل دیا۔

"میں آپ کی شکایت کروں گا دادا جان سے"

عمران نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"جب دادا جان آئیں گے تب دیکھا جائے گا"

نعمان نے لاپروائی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

عمران کو تو دادا جان بہت اچھے لگتے تھے۔ کیوں کہ وہ اسے اچھی اچھی باتیں بتاتے تھے۔ اُنہوں نے عمران کو عیدُ الاضحیٰ کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا تھا۔ مثلاً" یہ کہ عید پر حلال جانور قربان کرنا حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سُنّت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں نظر آیا تھا کہ وہ اپنے پیارے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اللہ کے حکم سے قربان کر رہے ہیں۔ صبح کو انہوں نے سچ مچ اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کی ٹھانی۔ یہ الگ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے حضرت اسماعیلؑ کی جان بچالی اور اُن کی جگہ ایک دُنبے کو بھیج دیا۔ بس عیدُ الاضحیٰ پر قربانی اسی واقعے کی یاد میں کی جاتی ہے اور اس موقع پر مسلمان اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے"۔ دادا جان نے یہ بھی بتایا کہ قربانی کے جانوروں کا خاص خیال رکھنا چاہئے اور اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچانی چاہئے۔

عمران تو جانوروں سے بہت محبّت کرتا تھا۔ یہ بات تو دراصل نعمان کے سمجھنے کی تھی اور اُس کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہیں تھی۔ "لگتا ہے بھائی جان کو کوئی سزا مل کے ہی رہے گی" عمران خوف زدہ ہو کر سوچتا۔

بقر عید کے دن قریب آ رہے تھے۔ عید کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ بچّوں نے تو بہت ہی اِنتظام کیا تھا۔ نئے کپڑے اور نئے جوتے خریدے تھے۔ نعمان کا اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا ارادہ تھا۔ اِس

روز وہ مختلف گلیوں میں جانوروں کو قربان ہوتے دیکھا کرتا تھا، جب کہ عمران گلی محلے میں قربانی کا گوشت بانٹتا تھا۔

عید سے ایک دن پہلے دادا جان بھی چچا جان کے گھر سے ان کے گھر آگئے تو عمران خوش ہو گیا، لیکن نعمان کا مُنہ بن گیا۔ دادا جان اُسے روک ٹوک جو کرتے تھے۔ اسکول سے واپس آکر اُس نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور بکرے کو لے کر باہر جانے لگا۔ عمران نے کہا کہ بکرے کو کچھ دانہ پانی تو دے دیں۔ مگر وہ کہاں سُنتا تھا۔ اُس نے کہا "آج فائنل ریس ہے" اور بکرے کو لے کر باہر نکل گیا۔ عمران سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ دادا جان نے اس سے پریشانی کا سبب پوچھا تو اس نے انہیں نعمان کی شرارتوں کا احوال سُنایا۔ دادا جان بھی فکر مند سے نظر آنے لگے۔ بولے "آ لینے دو اُسے۔ میں اُس کے کان کھینچوں گا۔ جانوروں کو ستانا اور خصوصاً قربانی کے جانوروں کو تنگ کرنا تو بہت ہی بُری بات ہے"۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

شام ہوئی تو ابّو جان بھی گھر آگئے۔ دادا جان بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئے تھے اور ابّو جان کے ساتھ صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ دروازہ زور زور سے کھٹ کھٹایا جانے لگا۔ ابّو جان نے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ محلّے کے لوگ ہیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ نعمان زخمی ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ساتھ بکرا بھی لے کر آئے تھے۔ ہوا یوں کہ نعمان اپنے دوستوں کے ساتھ بکروں کی ریس لگا رہا تھا کہ اس کا بکرا اڑ گیا۔ اس نے نعمان کے سینگ مار کر رسّی چھڑالی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ نعمان اُسے پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے بھاگا تو ایک کُھلے ہوئے مین ہول میں جا گرا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے اُسے باہر نکال کر ہسپتال پہنچایا۔

"دیکھا! میں نہ کہتا تھا کہ جانوروں کی بد دعا لو گے تو نقصان اٹھاؤ گے" دادا جان بستر پر لیٹے نعمان سے کہہ رہے تھے اور وہ رو رہا تھا۔

"مجھے مُعاف کر دیجئے، دادا جان۔ میں نے آپ کی بات نہیں مانی۔ ہائے! ہائے!" وہ تکلیف سے کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا "امّی جان، ابّو جان، آپ بھی مجھے معاف کر دیجئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ کسی کو نہیں ستاؤں گا"۔

"اب تو اللہ میاں سے مُعافی مانگو اور دعا کرو کہ وہ تمہیں جلدی سے اچھا کر دیں" ابّو جان نے محبّت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں نے اللہ میاں سے بھی مُعافی مانگی ہے۔ مگر ابّو جان، میری عید؟" نعمان نے روتے ہوئے کہا۔

"اب تو آرام سے ہسپتال کے بستر پر لیٹ کر اور اپنی غلطیوں کو یاد کر کے عید مناؤ۔ یہی تمہاری سزا ہے" دادا جان نے جواب دیا۔

"اور میرے نئے کپڑے اور جوتے؟" نعمان نے پوچھا۔

"وہ نئے کپڑے اور جوتے ہم افضل کو دے دیں گے کیوں کہ آپ نے ایک ہفتہ پہلے اُسے پتھر مار کر زخمی کر دیا تھا اور اس کی عید بھی خراب کر دی تھی" عمران نے جواب دیا۔

"اگر اب تم اچھا لڑکا بننے کا وعدہ کرو گے تو اگلی عید پر تمہارے کپڑے اور جوتے آئیں گے ورنہ نہیں" امّی نے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں" نعمان نے جلدی سے کہا اور سب نے سُکھ کی سانس لی۔ اللہ کی طرف سے دی جانے والی اس سزا نے نعمان کو اچھا سبق سکھا دیا تھا۔

حج اور عیدُ الاضحیٰ

بچوں کے لئے درس قرآن میں ہمارا موضوع ہے: حج اور عیدالاضحیٰ۔

حج اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ اس کا ذکر سورہ بقرہ، سورہ آل عمران، سورہ یونس اور سورہ حج کی مختلف آیات میں آیا ہے۔ حج بارھویں اسلامی مہینے یعنی ذی الحجہ کی 8 سے 12 تاریخ تک چند ایسی رسومات کی ادائیگی پر مشتمل ہے، جو مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ کے اندر اور باہر مختلف مقامات پر ادا کی جاتی ہیں۔ حج کے تیسرے روز یعنی 10 ذی الحجہ کو جانوروں کی قربانی دی جاتی ہے اور 12 ذی الحجہ کو تمام رسومات مکمل ہو جاتی ہیں۔ حج ایک ایسی غیر معمولی بین الاقوامی عبادت ہے جس میں دنیا بھر کے مسلمان شریک ہوتے ہیں۔

جو مسلمان مکہ مکرمہ میں حج کی رسومات میں شامل نہیں ہو سکتے وہ دس ذی الحجہ کو عیدالاضحیٰ کا تہوار مناتے ہیں۔ صاحب استطاعت لوگ جانوروں کی قربانی کی رسم ادا کرتے ہیں۔ قربانی کی رسم کے پیچھے ایک بہت اہم تاریخی واقعہ ہے۔ اللہ کے پیارے نبی حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کا حکم ہوا۔ چناں نچہ وہ اپنے لختِ جگر کو لے کر گھر سے نکل پڑے۔ ایک ویران جگہ پہنچ کر وہ اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ چوں کہ آپ نے اللہ کی ہدایت کی تعمیل پر فوری آمادگی کا اظہار کر دیا ہے اس لئے آپ فقط ایک جانور کی قربانی کر دیں۔ آپ نے اس حکم کی فوراً تعمیل کر دی۔ اس تاریخی واقعہ کا تفصیلی ذکر قرآن کریم کی سورہ الصّافات کی آیات نمبر 102 تا 109 میں ہوا ہے اور اسے "ذبح عظیم" یعنی بڑی قربانی قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل کرنے اور اس کی راہ میں اپنی پیاری اولاد کی قربانی کے لئے تیار ہو جانا کوئی عام بات نہیں۔ اس عظیم تاریخی واقعہ کی یاد تازہ رکھنے کے لئے دنیا بھر کے مسلمان اس روز ہر سال ایک عظیم الشان جشن مناتے ہیں اور اس تاریخی دن اس عزم کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ ہر قسم کی بڑی سے بڑی قربانی کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ مسرّتوں کے اسی تہوار کا نام عیدالاضحیٰ ہے۔ اس روز تمام مسلمان، خصوصاً بچے، نئے کپڑے پہنتے ہیں، طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور اچھی اچھی تفریحوں سے دل بہلاتے ہیں۔ ساری کائنات خوشیوں سے جھومتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

قلم کہاں گئے

مجھے جاسوسی یعنی سُراغ رسانی کا بہت شوق ہے' اور بقول میری بہن رِدا کے مجھ پر ہر وقت جاسوسی کا بھوت سوار رہتا ہے۔ اور یہ ہے بھی حقیقت۔ میرا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی مشکل سے مشکل کیس آپ مجھے بتا دیں' میں 24 گھنٹوں کے اندر اُسے حل کر دوں گا۔ ویسے تو کیس حل کرنے کے بہت سے واقعات ہیں' لیکن' مثال کے طور پر' میں آپ کو پچھلے دنوں کا ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ لیکن ذرا ٹھہریے..... پہلے میں اپنا تعارُف کرا دوں۔

میرا نام کامران ہے اور میں دسویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ مجھ سے چھوٹا عمران نویں میں ہے' پھر رِدا ہے جو چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے' اور پھر ہمارا چھوٹا بھائی سلمان عُرف مانی ہے جو حال ہی میں پہلی جماعت میں داخل ہوا ہے۔ گھر میں ہمارے علاوہ دادا جان' ابّو' امّی اور ایک عدد طوطا بھی ہے جو رِدا نے پالا ہے۔ اُس کا نام ہیرا ہے اور وہ بہت باتونی ہے۔

ہاں تو' میں آپ کو اُس کیس کے بارے میں بتا رہا تھا جو میرا بھائی عامی یعنی عمران پچھلے دنوں میرے پاس لایا۔ واقعہ یوں ہے کہ میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ عامی کچھ پریشان سا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود ہی اپنی پریشانی مجھے بتا دے گا' لیکن جب ایک ڈیڑھ ہفتے تک اُس نے کچھ نہیں بتایا تو ایک دن اسکول سے واپسی کے بعد جب ہم اپنے کمرے میں آرام کرنے لیٹے تو میں نے اُس سے پوچھا "کیا بات ہے' عامی؟ تم

کچھ دنوں سے پریشان ہو؟"

"ہاں..... نن..... نہیں تو۔ کوئی خاص بات نہیں ہے" عامی نے کہا۔

"تو پھر عام بات ہی بتا دو۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری پریشانی دور کر سکوں" میں نے نرمی سے کہا۔

"جی' مجھے معلوم ہے آپ کو بہت دنوں سے کوئی کیس نہیں ملا۔ اب آپ کا دل چاہ رہا ہے جاسوسی کرنے کو" عامی مسکرا کر بولا۔

"چلو' یہی سمجھ لو۔ اب بتا بھی دو" میں نے بے چینی سے کہا۔

"بات کچھ خاص نہیں ہے۔ بس ایک ڈیڑھ ہفتے سے میرے قلم پتا نہیں کہاں غائب ہو جاتے ہیں" عامی نے بتایا۔

"کیا مطلب! اب تک کتنے قلم غائب ہو چکے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اب تک تین۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اسکول میں کوئی نکال لیتا ہے۔ لیکن تیسرا قلم تو کل گھر سے غائب ہوا ہے۔ میں اسے اسکول نہیں لے گیا تھا۔"

"تم نے تیسرا قلم آخری دفعہ کہاں رکھا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہیں' میز پر۔ اسے میں نے یہاں پرسوں رات رکھا تھا اور سوچا تھا کہ روز دیکھوں گا کہ وہ ہے یا نہیں۔ لیکن اتفاق سے کل دیکھنا بھول گیا۔ اب آج دیکھا تو غائب تھا!" عامی نے جواب دیا۔

"ہوں! اب یہ بتاؤ' تینوں قلم کس کمپنی کے تھے' اور کس رنگ کے تھے؟"

"تینوں قلم ونگ سنگ کے تھے اور کالے رنگ کے تھے۔ ان پر سنہری کیپ یعنی ڈھکن لگا تھا" عامی نے بتایا۔

"کیا مطلب؟ تینوں قلم بالکل ایک جیسے تھے؟" میں نے مشکوک نظروں سے اُسے گھورا۔

"ہاں۔ جب پہلا قلم گم ہوا تو میں نے اسی طرح کا دوسرا خرید لیا۔ پھر جب وہ بھی گم ہو گیا تو ویسا ہی تیسرا خرید لیا"۔

"یہ بات تمہارے خلاف جا رہی ہے" میں نے کہا۔

"کیا؟ آپ مجھ پر ہی شک کر رہے ہیں؟" عامی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"جی' ہاں۔ سراغ رسانی کا پہلا اصول یہی ہے کہ کسی کو بھی شک سے بری نہ سمجھو" میں نے اس پر اپنی قابلیت جھاڑتے ہوئے کہا۔

"کیا فضول سا اصول ہے۔ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں اپنے قلم خود ہی غائب کر دیتا ہوں؟" عامی نے برا سا منہ بنایا۔

"میں نے یہ کب کہا ہے کہ ایسا ہی ہے۔ لیکن ممکن تو ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے تین قلم خریدے ہی نہ ہوں" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہو سکتا ہے تم نے صرف ایک ہی قلم خریدا ہو اور اسی کو کہیں چھپا کر ابو سے دوسرے قلم کے پیسے لے لئے ہوں اور یہ ظاہر کیا ہو کہ تم ویسا ہی دوسرا قلم لے آئے ہو' حال آں کہ وہ پہلے والا قلم ہی تھا" میں نے کہا۔

"جی' نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہو تو ویسے ہی ابو سے لے سکتا ہوں" عامی نے بُرا مان کر کہا۔

"اچھا' یہ بتاؤ' تم قلم خریدنے اکیلے گئے تھے یا کوئی اور بھی تمہارے ساتھ تھا؟"

"میں اکیلا ہی تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" عامی جلدی سے بولا۔

"مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تمہارے تینوں

قلم ایک جیسے ہی کیوں تھے" میں نے سوچتے ہوئے کہا خیر' چھوڑو--- تم نے یہ کیس میرے سپرد کیا ہے۔ اب اس کو حل کرنا میری ذمّے داری ہے۔ کل جمعہ ہے' اور اِن شاء اللہ کل سے میں اِس کیس پر باقاعدہ کام شروع کروں گا" میں نے کہا۔

اُسی دن شام کو' چائے کے وقت' جب امّی' ابّو اور دادا جان لاؤنج میں بیٹھے تھے تو میں نے عامی کا کیس اُن کو بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ میں کل آپ سب سے اس کیس کے بارے میں سوالات کروں گا۔

اگلے دن صبح کو میں نے دادا جان' ابّو اور امّی سے سوالات کر کے اُنہیں فارِغ کر دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ مُجرِم نہیں ہیں۔ گھر کے لوگوں کے عِلاوہ دو لوگ اور ایسے تھے جو گھر کے اندر بے تکلّفی سے آتے جاتے تھے۔ ایک تو کام کرنے والی ماسی تھی' اور دوسرا وہ ملازِم لڑکا جمیل تھا جو اُوپر کے کام کرتا تھا۔ ماسی پر تو شک کرنا مشکل تھا کیوں کہ وہ پچھلے سات آٹھ سال سے ہمارے یہاں ملازِم تھی۔ پھر بھی میں نے اس کو بالکل شک سے بَری نہیں کیا۔ مجھے کو اس کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس لئے اس سے سوالات اگلے دن ہی ہو سکتے تھے۔ جمیل دس گیارہ سال کا تھا اور نو دس ماہ پہلے ہمارے ہاں ملازِم ہوا تھا۔ وہ شام کو آتا تھا۔ اس لئے اب میں نے رِدا کے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔

"رِدا' مجھے تم سے کچھ ضروری سوالات کرنے ہیں" میں نے کہا۔

"کون سے سوالات؟ وہی عامی کے کیس والے؟" اُس نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ وہ ہمیشہ میرے اِس جاسوسی کے شوق کا مذاق اُڑاتی تھی۔

"ہاں' وہی" میں نے بُرا مانے بغیر کہا۔

"کافی بھائی' کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ خواہ مخواہ ہر وقت شرلاک ہومز بننے کی فکر میں لگے رہتے ہیں" اُس نے پھر مذاق اڑایا۔

"تو تم کو کیا تکلیف ہے؟ کیا میں کیس حل نہیں کر دیتا؟" میں نے اس کو گھورا۔

"ہمیشہ" وہ بے ساختہ ہنسی "زندگی میں صرف پانچ چھ کیس ہی تو حل کئے ہیں آپ نے"۔

"5' 6 نہیں پورے آٹھ۔ اور اب نو ہو جائیں گے' اِن شاء اللہ۔ اب تک جتنے کیس مجھے ملے ہیں' سارے ہی حل کر دیئے ہیں میں نے" میں نے اُس پر رُعب ڈالنا چاہا۔

"وہ سارے کیس فضول سے تھے۔ کوئی بے وقوف بھی اُنہیں حل کر سکتا تھا" وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

"اچھا' اچھا۔ اب زیادہ بحث کرنے کا میرے پاس

وقت نہیں ہے۔ جو میں پوچھوں' اس کا سنجیدگی سے جواب دینا" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"اچھا' کوشش کروں گی" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"یہ بتاؤ' تم نے عامی کے قلم استعمال کر کے دیکھے تھے؟"

"ہاں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ بس نام لکھ کر دیکھا تھا" وہ بولی۔

"تم کو اس پر حیرت نہیں ہوئی کہ اُس کے تینوں قلم بالکل ایک جیسے تھے؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ اُس کی مرضی کہ اُس نے ایک جیسے قلم خریدے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"حیرت کی بات ہے! لیکن تم نہیں سمجھو گی۔ اچھا' یہ بتاؤ' تم نے جب قلم سے لکھ کر دیکھا تو تم کو تیسرے قلم اور دوسرے قلم میں کوئی فرق محسوس ہوا تھا؟ یعنی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ یہ کوئی دوسرا قلم نہیں ہے بلکہ پرانا قلم ہی ہے"۔

"فرق؟" وہ سوچتے ہوئے بولی "دوسرے اور تیسرے قلم کے فرق کا تو مجھے پتا نہیں' البتہ پہلے قلم اور دوسرے قلم میں فرق ضرور تھا۔ پہلے قلم کی نب بہت نرم ہو گئی تھی اور دوسرا قلم تھوڑا سا کھردرا لکھ رہا تھا' جیسا کہ نئے قلم کچھ عرصے تک لکھتے ہیں" اُس نے بتایا۔

"ہوں! تمہارے پاس کون سے قلم ہیں؟ دکھانا ذرا"۔ میں نے اُس کے پنسل باکس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"فکر نہ کریں۔ میرے پاس ونگ سنگ کے قلم نہیں ہیں۔ میں ہیرو کے قلم استعمال کرتی ہوں" اُس نے مجھے اپنا قلم دکھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم سے سوالات مکمل ہو گئے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

جمعے کی نماز کا وقت قریب تھا' اس لئے سوچا کہ فی الحال ہیرے سے سوالات کر لئے جائیں۔ باقی کام شام کو ہو گا۔ ہیرا بہت عقل مند طوطا ہے اور اکثر باتوں باتوں میں بڑے کام کی بات کر جاتا ہے۔

میں اُس کے پنجرے کے پاس گیا تو وہ مجھے دیکھتے ہی بولا "ہیلو' کامی"۔

"ہیلو" میں نے جواب دیا "تمہیں معلوم ہے کہ عامی کے قلم چوری ہو گئے ہیں؟"

"اچھا! مبارک ہو!" ہیرے نے بے پروائی سے کہا۔

"کیا؟ بے وقوف!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ پھر فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ طوطے کو کوئی ایسی غلط بات نہیں سکھانی چاہئے جو وہ کسی کے سامنے کہے تو

شرمندگی ہو۔ میں جلدی سے بولا "میرا مطلب ہے' اگر کوئی چیز چوری ہو جائے تو اُس پر مُبارک باد نہیں دی جاتی"۔

"پھر کیا دیا جاتا ہے؟" ہیرا بولا۔

"کچھ نہیں دیا جاتا۔ افسوس کا اظہار کرتے ہیں" میں نے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا' بہت افسوس ہوا" ہیرے نے غم گین آواز میں کہا۔ مجھے ہنسی آگئی۔

"اچھا' اب ذرا میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دو"۔

"جی' پوچھئے"۔

"تم بتا سکتے ہو کہ عامی کے قلم کہاں جا سکتے ہیں؟"

"عامی کے قلموں کا تو مجھے پتا نہیں' البتہ مانی' ابّو کے ساتھ' کچھ دن پہلے گلاب کی قلمیں لگا رہا تھا" ہیرے نے کہا۔

"اُفوہ! بھئی۔ وہ دوسری قلمیں ہوتی ہیں" میں اُکتا کر اُس کے پاس سے اُٹھ گیا۔

"خدا حافظ!" ہیرے نے مجھے جاتا دیکھ کر نعرہ لگایا۔

"خدا حافظ!"

شام کو میں نے دوبارہ سارے کیس پر غور کیا اور سب سے پوچھے گئے سوالات ذہن میں دہرائے تو اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہیرے کے یہ الفاظ میرے دماغ میں گونجے "عامی کے قلموں کا تو پتا نہیں' البتہ مانی' ابّو کے ساتھ' کچھ دن پہلے گلاب کی قلمیں لگا رہا تھا"۔

ابّو کی حد تک تو ٹھیک تھا لیکن مانی تو اتنا چھوٹا ہے۔ 5 برس کا بچّہ گلاب کی قلمیں کیسے لگائے گا! میں تیزی سے اُٹھ کر مانی کے پاس گیا۔ وہ باہر لان میں جمیل کے ساتھ پکڑم پکڑائی کھیلنے میں مصروف تھا۔ میں نے جمیل کو اندر بھیج دیا اور مانی سے بڑے پیار سے پوچھا:

"مانی' تم نے ابو کے ساتھ مل کر گلاب کی قلمیں لگائی تھیں ناں؟"

"جی۔ لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟" مانی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"بس' پتا چل گیا۔ لیکن تم نے قلمیں کہاں لگائی ہیں؟"

"آپ ابّو کو تو نہیں بتائیں گے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا ابّو سے چُھپا کر لگائی تھیں؟" میں نے کہا۔

"جی۔ ابو کہہ رہے تھے کہ بچے قلمیں نہیں لگاتے۔ لیکن میرا دل چاہ رہا تھا۔ اس لئے میں نے ابّو سے چُھپ کر لگا دیں۔ جب اُن میں پھول آجائیں گے تو میں ابّو کو دکھاؤں گا" مانی بولا۔

"اچھا' ٹھیک ہے۔ نہیں بتاؤں گا ابّو کو۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے قلمیں کہاں لگائی ہیں؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

وہ مجھے گھر کے پچھلے حصّے میں لے گیا' جہاں کیاری بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ میں نے بھی ڈھونڈا لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

"کہاں گئیں؟ یہیں تو لگائی تھیں" مانی نے حیرت سے کہا۔

"قلمیں کس طرح کی تھیں اور تمہارے پاس کہاں سے آئی تھیں؟"

"میں نے عامی بھیّا کی قلمیں لے لی تھیں۔ میرے پاس خود سے تو قلم ہوتے نہیں۔ پنسل سے کام کرتا ہوں" مانی نے معصومیت سے کہا۔

"کیا؟ تم نے عامی کے قلم لے کر کیاری میں لگا دیئے؟" میں حیرت سے چیخا۔

"ہاں تو' ابّو بھی تو لگاتے ہیں قلمیں" مانی نے

سہم کر کہا۔

"ارے بھئی' وہ دوسری قلمیں ہوتی ہیں۔ تم نے عامی کے کتنے قلم لئے تھے؟"

"تین" اس نے جلدی سے کہا۔

"تیسرا کب لگایا تھا؟"

"کل' دوپہر کو' جب سب سو رہے تھے" منی نے آہستہ سے کہا۔

"کل تک باقی دونوں قلم بھی یہاں موجود تھے؟"

"جی' تھے۔ میں نے آ کر دیکھا تھا"۔

"پھر اب کہاں چلے گئے؟" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ اچانک میرا خیال جمیل کی طرف گیا۔ اب صرف جمیل اور ماسی ہی رہ گئے تھے' جن سے سوالات نہیں ہوئے تھے۔ میں فوراً جمیل کے پاس گیا۔

"جمیل' اِدھر آؤ"۔

"جی' کامی بھائی"۔

"اِدھر بیٹھو' اور دیکھو' میرے سوالات کے بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دینا"۔

"جی' اچھا" جمیل نے کہا۔

"تم نے باہر کیاری میں سے قلم تو نہیں اٹھائے؟"

"جج..... جی..... مم..... میں نے؟ نہیں تو" وہ بوکھلا کر بولا۔

"دیکھو! سچ سچ بتاؤ! میں تم کو کچھ نہیں کہوں گا۔ بتاؤ' کہاں ہیں وہ قلم؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"وہ..... وہ....." وہ جھجک کر کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

"ہاں' ہاں۔ شاباش! بتاؤ" میں نے اُس کو حوصلہ دیا۔

"وہ' کامی بھائی' آپ مجھے ماریں گے تو نہیں؟ قسم سے میں نے وہ چُرائے نہیں ہیں۔ وہ تو باہر کیاری میں پڑے تھے۔ میں نے کل شام وہاں سے اُٹھا لئے" وہ ڈرتے ڈرتے بولا "میں سمجھا کہ وہ بے کار ہیں' جبھی باہر پڑے ہیں۔ ابھی اندر آیا تو پتا چلا کہ عامی بھیّا کے تین قلم غائب ہیں۔ میں آپ کو بتانے ہی والا تھا" وہ جلدی سے بولا۔

"تمہیں کل ہی ہمیں بتانا چاہئے تھا۔ اچھا' کوئی بات نہیں۔ اب کہاں ہیں وہ قلم؟" میں نے سوال کیا۔

"وہ تو میرے گھر میں ہیں"۔

"تو پھر جلدی سے لے آؤ" میں نے کہا۔

"ابھی؟" اُس نے حیرت سے کہا۔

"ہاں' ابھی" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

جمیل کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد ہی وہ قلم لے کر واپس آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے لاؤنج میں سب کو جمع کر کے ڈرامائی انداز میں تینوں قلم پیش کئے تو سب لوگ حیرت سے اُچھل پڑے۔

پھر میرے اُوپر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی اور میں جلدی جلدی سب کو تفصیل بتانے لگا۔ اور ہاں' اب ردا بھی کافی حد تک میری جاسوسی کی قائل ہو گئی ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے؟ میں اچھا جاسوس ہوں ناں؟

عبدالستار خان طاہر

ماریہ

اُس کا نام ماریہ تھا۔ اُس کی عمر صرف آٹھ برس تھی۔ اُس کے بال گھنے اور سیاہ تھے' جس طرح ساون بھادوں کی گھٹائیں ہوتی ہیں۔ ان بالوں میں دھوپ جیسا سنہرا پن گندھا ہوا تھا۔ وہ دبلی پتلی مگر صحت مند بچی تھی۔ جب وہ ہنستی تو اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک پیدا ہو جاتی جو ستاروں کی روشنی کو بھی مات کر دیتی' اور اس کے دانت ایسے چمکتے جیسے سینکڑوں موتی ایک قطار میں چُن دیے گئے ہوں۔ وہ کم عمر ہونے کے باوجود بڑی عقل مند اور سمجھ دار تھی۔ ایک شام وہ اپنی امی کے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی "امّی جان' یہ سب کچھ کتنا پیارا اور مزے دار ہے"۔

امّی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "کیا---؟"

"یہی' اسکول جانا' برف گرنے کا نظارہ کرنا' سہیلیوں کے ساتھ کھیلنا۔ امی' سچ' زندگی بہت مزے دار ہے"۔ امّی نے اس کی طرف پیار سے دیکھا' پھر نظریں جھکا کر دل میں کہنے لگیں "کتنی اچھی باتیں کرتی ہے۔ اے خدا' میری بچی کو ہمیشہ سلامت رکھنا"۔

ماریہ مری کے خوب صورت شہر میں پیدا ہوئی تھی' جہاں ہر طرف سرسبز پہاڑ ہیں اور سردیوں میں جب برف باری ہوتی ہے تو یہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کے ابو پولیس کے اس دستے میں شامل تھے جو پہاڑی علاقوں میں گشت کرتا ہے۔ اس دستے کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد میں ہے۔

ماریہ کی سب سے گہری سہیلی شازیہ تھی۔ دونوں سہیلیاں ایک دوسری کو دل و جان سے چاہتی تھیں۔ مگر پڑھنے کے معاملے میں ایک دوسرے کا لحاظ نہیں کرتی تھیں۔ دونوں سر توڑ کوشش کرتی تھیں کہ سب سے زیادہ نمبر حاصل کریں۔ ماریہ اور شازیہ چوں کہ پوری جماعت

میں سب سے زیادہ ذہین تھیں' اس لئے انھی دونوں کے درمیان مقابلہ رہتا۔ شازیہ کے گھر کے پاس ہی ماریہ کی دوسری سہیلیوں کے گھر تھے۔ سب مل کر پڑھتیں' کھیلتیں اور شرارتیں کرتی تھیں۔ ماریہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد نہ تھی۔ عادل ماریہ سے دو سال بڑا تھا۔ اس کے بعد قیصر' فرزانہ' فرحانہ اور فیصل کا نمبر تھا۔ یہ چاروں بہن بھائی ماریہ سے چھوٹے تھے۔

ماریہ بچی تھی' اس لئے اس کی سوچ بھی معصوم تھی۔ وہ عجیب عجیب باتیں سوچا کرتی تھی۔ وہ سوچتی کہ سردیوں میں جب سارے درختوں اور زمین کو برف ڈھانپ لیتی ہے تو بے چارے پرندے کہاں سے کھاتے ہیں۔ جب وہ کوئی درد بھری کہانی سنتی تو اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگتی۔ وہ سوچتی کہ لوگ ایک دوسرے پر ظلم کیوں کرتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار باتیں تھیں جن کے بارے میں وہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ ایک رات ٹیلی وژن پر اندھوں کے بارے میں ایک پروگرام دکھایا جا رہا تھا۔ جب ٹی وی اناؤنسر نے بتایا کہ آنکھوں کا عطیہ دینے سے اندھے لوگوں کی بینائی بحال ہو سکتی ہے تو ماریہ کا ننھا سا دل بڑے جوش سے دھڑکنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اسکرین پر ایک عورت دکھائی گئی جو اندھی ہو گئی تھی۔ ایک شخص نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اس کی آنکھیں آئی بینک (آنکھوں کے بینک) کو دے دی جائیں۔ یہ آنکھیں اس اندھی عورت کی آنکھوں کی جگہ لگا دی گئیں اور اب وہ دنیا کی ساری رنگینیاں دیکھ رہی تھی۔

ٹی وی کا یہ پروگرام ختم ہو گیا۔ آٹھ برس کی ماریہ گہری سوچوں میں ڈوبی رہی اور پھر وہ کچھ سوچ کر اٹھی۔ اس کی امی اس وقت باورچی خانے میں تھیں۔ وہ ان سے کہنے لگی۔ "امی' میں مرتے وقت اپنی آنکھیں آنکھوں کے بینک کو دے دوں گی"۔ امی اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گئیں۔ انہوں نے ماریہ کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو تھلک رہے تھے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "امی! دنیا میں بہت سارے لوگوں کو مدد کی ضرورت ہے۔ اگر لوگ مرتے وقت اپنی آنکھیں اندھوں کو دے دیں تو بہت سے لوگوں کو آنکھیں مل سکتی ہیں۔ ماریہ کی امی اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئیں۔ وہ کہنے لگیں "بیٹی' تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر تم ابھی بچی ہو۔ ممکن ہے تم بڑی ہو کر یہ فیصلہ بدل دو"۔

"نہیں' امی" ماریہ نے اپنے سیاہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا "کبھی نہیں' میں یہ فیصلہ کبھی نہیں بدلوں گی"۔

جنوری اور فروری کے مہینوں میں مری کے خوب صورت پہاڑوں پر خوب برف باری ہوئی۔ ہر چیز سفید نظر آ رہی تھی۔ روزانہ آسمان سے اتنی برف گرتی گویا آسمان پھٹ پڑا ہو۔ صبح اٹھ کر لوگ اپنے مکانوں کی چھتوں سے برف ہٹاتے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے صحنوں اور دروازوں کے آگے سے بھی برف ہٹانا پڑتی تھی۔ ماریہ دوپہر کے بعد گھر سے نکل جاتی اور پہاڑوں کے دامن میں کھیلتی پھرتی۔ وہ وہاں برف کے گھروندے بناتی' جن میں گھر کے تمام لوگوں کے لئے الگ الگ کمرے ہوتے۔ جب وہ گھر لوٹتی تو اس کے رخسار سرخ ہوتے۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ مگر ایک دن اسے برف پر کھیلتے ہوئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ اسے یوں لگا جیسے اس کی تمام طاقت ختم ہو گئی ہے۔ وہ تھکن سے نڈھال ہو گئی اور سہیلیوں کے سہارے بڑی مشکل سے گھر پہنچی۔ کھانے کی میز پر بھی اس سے چند لقموں سے زیادہ نہ کھایا گیا۔ اسے نہ تو بخار تھا اور نہ سردی لگی تھی۔ اس کی امی پریشان ہو گئیں۔

چند ہفتوں بعد اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آنے لگے۔ اس کا سر ہر وقت دکھتا رہتا۔ کھانے کی خوش بو سے دل خراب ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ بیٹھے بیٹھے چیخ اٹھتی "میری کمر میں درد ہو رہا ہے"۔ تھوڑی دیر بعد درد کی یہ

لہر خود ہی ختم ہو جاتی۔ امّی اسے آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ کہتی۔ "امی' شازیہ سے میرا مقابلہ ہے۔ وہ آگے نکل جائے گی۔ میں اسکول ضرور جاؤں گی"۔

ایک دن جب دوپہر کے بعد ٹھنڈی یخ ہوا چل رہی تھی' وہ وقت پر اسکول سے گھر نہ لوٹی۔ اس کے بہن بھائی اور امی کھڑکی کے پاس بیٹھے اس کی راہ تک رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ وہ کندھے پر کتابوں کا بیگ لٹکائے لڑکھڑاتی ہوئی آ رہی ہے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی گر پڑے گی۔ اس کا سات برس کا بھائی' قیصر' بہن کی مدد کے لئے باہر بھاگا۔ اس نے اس کی کتابیں اٹھائیں اور اسے سہارا دے کر گھر لے آیا۔ ماریہ نے گھر پہنچ کر کہا "نہ جانے مجھے اچانک کیا ہو گیا تھا۔ ایک قدم بھی نہ چلا جا رہا تھا۔ میں تھک گئی ہوں"۔ یہ کہ کر وہ کرسی پر گر پڑی۔

رات کو جب اس کے ابو گھر آئے تو ماں باپ نے فیصلہ کیا کہ اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہئے۔ دوسرے دن شام کو' ماریہ اپنے ابّو کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی۔ اس نے اس کا معائنہ کیا۔ پھر اس کی انگلیوں سے تھوڑا سا خون نکالا۔ یہ کام کر کے وہ اس کے ابو سے کہنے لگا "کل اسے لیبارٹری لے جایئے اور اس کا خون چیک کرایئے"۔

ماریہ کے ابّو نے پوچھا "ڈاکٹر' بات کیا ہے؟" تو ڈاکٹر نے انہیں تسلّی دے کر ٹال دیا۔ اگلے دن وہ ماریہ کو لیبارٹری لے گئے' جہاں اس کی انگلیوں اور رگوں سے خون کے نمونے حاصل کئے گئے۔ دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر نے فون پر ماریہ کے ابو سے کہا "سنیے' میں کچھ پریشان ہوں۔ ماریہ کو فوراً ہسپتال میں داخل کرا دیجئے۔ میں نے اس کے داخلے کا بندوبست کر دیا ہے"۔

میاں بیوی نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ آخر باپ نے ہمت کر کے ڈاکٹر سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب' یہ تو بتایئے کہ ماریہ کو کیا بیماری ہے؟"

"میرے خیال میں اسے 'بلڈ کینسر' (خون کا سرطان) ہو گیا ہے"۔ ڈاکٹر نے رک رک کر کہا۔

ماریہ نے ہسپتال جانے سے انکار کر دیا' کہنے لگی "امّی' میں تن درست ہوں۔ اسکول نہ گئی تو پیچھے رہ جاؤں گی"۔ مگر اسے ماں باپ کے اصرار پر ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ اُسے بچّوں کے وارڈ میں بستر دیا گیا تھا۔ اس کی امی ہر روز شام کو اس سے ملنے جاتیں۔ اس نے ہسپتال کے دوسرے بچوں سے دوستی کر لی تھی۔ وہ ان سے ڈھیروں باتیں کرتی' اپنے اسکول کے متعلّق' اپنے کھلونوں کے متعلّق۔

ایک دن اس کی امی اس سے ملنے آئیں تو اس نے کہا "امی' ہر روز میری انگلیوں سے خون نکالا جاتا ہے۔ میں تھک گئی ہوں"۔ ہسپتال میں خون کے ماہر ڈاکٹر شمس الحق اس کا علاج کر رہے تھے۔ ایک دن انہوں نے ماریہ کے ابو کو فون کیا کہ وہ فوراً ان سے آ کر ملیں۔ ابو ان کے پاس گئے تو انہوں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے بڑے غم گین لہجے میں کہا۔ "ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کو خون کا کینسر ہے۔ اس مرض کا ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں کیا جا سکا۔ بچّی زیادہ سے زیادہ ایک برس یا اس سے ایک دو ماہ اوپر جی سکتی ہے۔ اب آپ اسے گھر لے جائیں۔ ہفتے میں ایک بار اسے' معائنے کے لئے' ہسپتال لے آیا کریں"۔ پھر ڈاکٹر نے بڑے دکھی دل کے ساتھ کہا۔ "بچی کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا جائے۔ صرف یہ بتا دیں کہ اس کے خون میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے جو جلد ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ وہ جس طرح زندگی بسر کرتی رہی ہے' اب بھی ویسے ہی کھیلے' کودے اور اسکول جائے"۔

بدنصیب ماریہ کا بدنصیب باپ سارا راستہ سوچتا رہا کہ وہ اپنی بیوی کو یہ خبر کس طرح سنائے گا۔ جوں ہی وہ گھر پہنچا' اس کی بیوی نے رونا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے شوہر کے چہرے پر سب کچھ پڑھ لیا تھا۔ یہ بہار کے دن تھے۔ ہر طرف رنگ برنگ پھول کھل رہے تھے اور

کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ ہریالی دیکھنے والوں کی آنکھوں کو تراوت بخش رہی تھی۔ ماریہ اپنی گلی میں پہنچی تو سہیلیوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخنے لگی "میں گھر آگئی ہوں۔ اب ہم سب جی بھر کر کھیلیں گے' پڑھیں گے"۔

ماریہ کی امّی ماریہ کو اسکول جاتے اور سہیلیوں کے ساتھ کھیلتے دیکھتیں تو انہیں یوں لگتا جیسے انہوں نے ماریہ کی بیماری کے بارے میں کوئی خواب دیکھا تھا۔ مگر جب کھانے کی میز پر اسے نمک کے بغیر کھانا دیا جاتا تو پھر ان کے لئے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو جاتا۔ ماریہ اب خوب کھانے لگی تھی۔ اس کے گالوں پر پھر سُرخی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے ماں باپ نے' ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق' اپنی بچی کو اس کی بیماری کے بارے میں کچھ نہ بتایا تھا۔ وہ اپنی پیاری بچّی کو موت کی کھائی کی طرف بڑھتا دیکھ رہے تھے۔ موت کا وہ متوحش لمحہ کسی وقت بھی اسے دبوچ سکتا تھا اور پھر ماریہ' اُن کے جگر کا ٹکڑا' اُن سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جاتا۔

ماریہ کے ابو اسے ہر جمعرات کو ہسپتال لے جاتے۔ جب وہ ہسپتال جاتی تو نرس اور ڈاکٹر اسے پیار کرتے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ننھی سی کلی اب مرجھانے والی ہے۔ جب وہ ہسپتال سے جاتی تو نرسوں کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں' ڈاکٹر منہ چھپا کر رونے لگتے۔

ستمبر کا مہینا آگیا تھا۔ یہ ماریہ کی سال گرہ کا مہینا تھا۔ اس کے ماں باپ نے اسے سال گرہ کے تحفے میں ایک بائی سکل دی۔ وہ اپنی پیاری سہیلی شازیہ کو سائیکل پر سوار کر کے خوب سیر کراتی۔ وہ اب صحت مند نظر آتی تھی۔ مگر اکتوبر میں وہ پھر بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اس کے ابو کو نئی دوائی دے کر کہا۔ "حالت پہلے سے زیادہ ہی خراب ہے"۔

ایک دن ماریہ نے اپنی امّی سے کہا "امّی! میرا خون کب ٹھیک ہو گا؟ اتنے دن سے دوا کھا رہی ہوں۔ کبھی ٹھیک ہو گا بھی یا نہیں؟" بیمار ہونے کے بعد ماریہ کا پہلا سوال تھا جو اس نے اپنی امی سے پوچھا تھا۔ امّی اس کو سینے سے لگا کر بولیں۔ "بیٹی' تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ بالکل صحت مند' موٹی تازی۔ بس تھوڑے دن کی تکلیف ہے۔ اسے برداشت کر لو"۔ کہنے کو تو انہوں نے یہ بات کہہ دی لیکن پھر کمرے میں جا کر رونے لگیں۔ کیوں کہ یہ بات انہوں نے اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے کہی تھی۔ اصل بات تو اس کے الٹ تھی۔

ماریہ کی طبیعت پھر سنبھل گئی تھی۔ مارچ آیا تو وہ پھر صحت مند ہو گئی۔ اس کا وزن بھی بڑھ گیا تھا۔ اگر اسے کوئی تکلیف تھی تو صرف اتنی کہ اس کا سر اکثر دکھتا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے ابو اور امی کو یاد دلایا کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو اس کی آنکھیں آنکھوں کے بینک کو دے دی جائیں۔

ماریہ کے ماں باپ مایوس نہ تھے۔ وہ دن رات اس کی شفا یابی کے لئے دعائیں کرتے۔ ان کا دل کہتا کہ چند دنوں میں سائنس دان کوئی نئی دوا ایجاد کر لیں گے' جس سے کینسر کا علاج ممکن ہو سکے گا اور ان کی پیاری بچی کی زندگی بچ جائے گی۔ دن گزرتے گئے۔ اور ستمبر آگیا۔ ماریہ کی دسویں سال گرہ منائی گئی۔ اس نے سالگرہ کے دن امّی اور ابو سے وعدہ کیا کہ وہ اس برس جماعت میں اول آئے گی۔ پچھلے سال ہسپتال میں رہنے کی وجہ سے وہ' سخت محنت کے باوجود' دوسرے نمبر پر آئی تھی۔ مگر اب وہ کوئی کسر نہ چھوڑے گی۔ ماں باپ کے دل سے دعا نکلی "یا خدا! ایسا ہی ہو۔ ہماری بچّی زندہ رہے"۔

مگر ماریہ لڑائی ہار گئی تھی۔ ڈیڑھ برس سے وہ موت سے لڑ رہی تھی۔ ایک بار پہلے بھی اسے خون دیا گیا تھا اور اب پھر خون کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی' اور اب ہر دس دن کے بعد اسے خون دیا جانے لگا تھا۔ اس سے اسکول چھوٹ گیا۔ اب اس کے جسم سے خون نکالا جاتا تو اسے تکلیف ہوتی۔ ڈیڑھ سال سے وہ دوا کھا رہی تھی۔ اس کی شکل بھی بدل رہی تھی۔ چہرہ دبلا اور سانولا ہو

گیا تھا۔ جسم پھولنے لگا تھا۔

اسکول کی ایک بچی اس سے ملنے آئی تو کہنے لگی "ماریہ! تم کتنی موٹی اور بھدّی ہو گئی ہو"۔ اُس کے اِس جملے نے ماریہ کے ننھّے سے دل کو زخمی کر دیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دن اس کی کمر میں شدید درد شروع ہو گیا۔ اسے فوراً" ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹر شمس الحق نے اس کے والدین سے کہا۔ "اسے اب ہسپتال میں ہی رہنا چاہئے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کا درد کسی طرح کم ہو سکے"۔

درد کی شدّت کے باوجود ماریہ مایوس نہ تھی۔ وہ کہتی "میں ایک ہفتے میں تن درست ہو کر گھر چلی جاؤں گی"۔ مگر دن گزرتے گئے۔ وہ ہسپتال سے گھر نہ جا سکی۔ اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ مرنے والی ہے۔ وہ کبھی کبھی بستر سے اٹھ کر ہسپتال کے چھوٹے سے باغ میں چلی جاتی، اور بینچ پر بیٹھ کر دیر تک نہ جانے کیا سوچتی رہتی۔ ایک دن اس کی اسکول کی استانی اسے دیکھنے آئی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کی جماعت کی تمام لڑکیوں نے اس کے نام پیارے پیارے خط بھیجے تھے۔ اس نے اپنی جماعت کی لڑکیوں کے بارے میں استانی سے اتنی باتیں پوچھیں کہ اُستانی جواب دیتے دیتے تھک گئی۔

چند دنوں بعد اسے پھر ہسپتال سے گھر بھیج دیا گیا۔ مگر ڈاکٹروں نے اسکول جانے کی اجازت نہ دی۔ وہ سارا دن کھڑکی کے قریب بیٹھی رہتی۔ جب تک اسکول کا ایک ایک بچہ نہ آ جاتا، کھڑکی سے نہ ہٹتی۔ شام کے بند اس کی سہیلیاں آ جاتیں۔ اس کی پیاری سہیلی شازیہ آتی تو دونوں گھنٹوں باتیں کرتیں۔

ایک دن درد نے پھر اس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ابو اسے ہسپتال لے گئے۔ وہ درد سے چیخ رہی تھی۔ ایک بار پھر اسے ہسپتال میں ٹھہرنا پڑا۔ اس بار اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے وہ زار و قطار رونے لگی۔ اور پھر اس نے اپنی کاپی پر لکھنا شروع کیا۔

"اس وقت میں اپنی امّی، پیاری پیاری سی امّی اور ابو کے لئے آنسو بہا رہی ہوں۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ میں گھر جانا چاہتی ہوں۔ مجھے گھر کی یاد ستا رہی ہے۔ مجھے اپنے ابو اور امی سے بڑا پیار ہے۔ مجھے اپنے بہن بھائی یاد آ رہے ہیں۔ میں اپنے اسکول جانا چاہتی ہوں تاکہ اپنے امی ابو سے کیا ہوا وعدہ پورا کر سکوں اور اپنی جماعت میں اول آؤں۔ کاش! اے کاش! میں تن درست ہوتی اور یوں ہسپتال میں بے بس نہ پڑی ہوتی۔ اف! میرے خدا! میں کہاں قید ہو گئی ہوں!"

جب اس کے ابّو اس سے ملنے ہسپتال آئے تو اس کی یہ تحریر پڑھ کر اُن کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ ماریہ کو گھر جانے کی اجازت دے دے۔ ڈاکٹر نے چند لمحے کچھ سوچا، پھر اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ جب وہ گھر پہنچی تو اپنے بھائی بہنوں سے خوب خوب گلے ملی اور ان سے ڈھیروں باتیں کیں۔ لیکن گھر آ کر بھی درد نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ درد اُس کے جسم کا ایک حصّہ بن گیا تھا۔ تکلیف بڑھ گئی تو اس کے ابّو نے پھر اسے ہسپتال لے جانے کا فیصلہ کیا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال کر ہسپتال لے جانے لگے تو اس نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اپنے خوب صورت گھر پر ڈالی اور پھر اپنے بھائی بہنوں اور سہیلیوں سے کہنے لگی:

"میں تمہیں کبھی نہ بھولوں گی۔ مجھے بھی تم کبھی نہ بھلانا۔ تم سب کی یادیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔ اچھا، خدا حافظ!"۔

ہسپتال میں ڈاکٹر نے ماریہ کی امی اور ابو کو بتایا افسوس! اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جس بُرے وقت کا انتظار تھا، وہ آ چکا ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں

اس ننھی سی کلی کو بچا لیتا۔ کاش! کوئی معجزہ ہو جائے"۔

درد کی شدت کی وجہ سے اُسے مارفین کا ٹیکا لگایا گیا مگر درد پھر بھی کم نہ ہوا۔ اس کے سارے عزیز، رشتے دار اسے دیکھنے آ رہے تھے۔ ہر شخص اس سے پوچھ رہا تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہے۔ کسی چیز کو دل چاہتا ہو تو بتائے۔ اس کی زندگی کے آخری لمحوں میں اسے خوش دیکھنے کے لئے وہ اس کو ہر چیز دینے کو تیار تھے۔ مگر اس پھول سی بچی کی خواہش بڑی عجیب تھی۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ اسے کون سا مرض ہے۔

اُس نے اپنے بھائی بہنوں اور سہیلیوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ہسپتال میں بچّوں کو لانے کی اجازت نہ تھی۔ مگر اس کے لئے اجازت دے دی گئی۔ اس نے اپنی کتابیں اور کھلونے اپنے بھائی بہنوں میں بانٹ دیئے۔ اس کی ماں دل پر صبر کی سل رکھ کر سب کچھ دیکھتی رہی۔ جب بہن بھائی اور سہیلیاں چلی گئیں تو اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "امی! اب میں بالکل تیار ہوں۔ آج صبح میں نے نرسوں سے کہا تھا کہ مجھے نہلائیں۔ میں نے آج غسل کیا ہے"۔

اُس کی ماں ہچکیوں پر قابو نہ پا سکی۔ وہ اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ شام کو جب اس کے باپ اور ماں اس کے قریب بیٹھے تھے تو وہ اچانک کہنے لگی "ابّو! کیا آپ نے آنکھوں کے بینک والوں سے بات کر لی ہے؟" اس کے باپ کو یوں لگا جیسے اس کا جگر کاٹا جا رہا ہو۔ وہ اسے بہلانے لگا "ماریہ! میری پیاری بیٹی! کیسی باتیں کرتی ہو؟ تم زندہ رہو گی اور چند دنوں میں خود چل کر اپنے گھر جاؤ گی"۔

"نہیں، ابّو۔ وقت کم ہے۔ آپ فوراً انتظام کریں۔ یہ میری خواہش ہے۔ اب میں زندہ نہیں رہوں گی"۔

باپ اور ماں نے ایک دوسرے کی طرف دُکھ سے دیکھا۔ ماں نے سر ہلایا۔ باپ اُٹھ کر ایک نرس کی طرف گیا۔ "نرس! میری بیٹی کی خواہش ہے کہ جب اس کا انتقال ہو جائے تو اس کی آنکھیں آنکھوں کے بینک کو دے دی جائیں۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں"۔

اگلے ایک گھنٹے میں ماریہ کی خواہش پوری ہو گئی۔ اس کو ایک فارم دیا گیا اور اس نے مسکرا کر اس پر دستخط کر دیئے۔ پھر ایک لمبا سا سانس بھر کر بولی "آپ کا شکریہ۔ آج میں نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے"۔

"نو بجے اس کی حالت نازک ہو گئی۔ وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی، مگر ناکام رہتی۔ پھر اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ چیخی امّی! ابّو! عاطل! قیصر! فرزانہ! فرحانہ! فیصل اور میری پیاری سہیلیو! میرے قریب آؤ۔ میں آخری بار تم سب کو دیکھنا چاہتی ہوں"۔ ماں باپ، بہن بھائی اور سہیلیاں اس پر جھک گئے۔ نو بج کر پچیس منٹ پر اُس نے ان سب پر آخری نگاہ ڈالی اور پھر ایک ہلکی سی ہچکی کے ساتھ اس کی پلکیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ چند گھنٹوں بعد اس کی آنکھیں آنکھوں کے بینک کو پہنچ چکی تھیں۔ ننھی سی اس کلی نے جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دیا تھا اور اب یہ آنکھیں کسی اندھے کے چہرے پر لگ کر دنیا کی رنگینوں کو نئے سرے سے دیکھنے والی تھیں۔

یوں تو ماریہ ایک ننھی سی بچّی تھی، لیکن اُس نے کام بڑوں سے بھی بڑا کیا اور ہمارے لئے ایک مثال قائم کر گئی۔

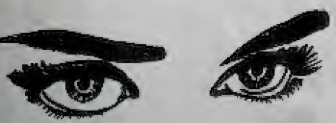

ایک گھنٹے میں.....

آپ 500 بار پلک جھپکتے ہیں اور آپ کا دل 2 ٹن خون پمپ کرتا ہے۔

آپ کا جسم اِتنی حرارت خارج کرتا ہے جس سے ایک لیٹر پانی اُبالا جا سکتا ہے۔ آپ کی اُنگلیوں کے ناخُن ایک انچ کا 327 واں حصّہ بڑھتے ہیں۔

دنیا میں 12,000 بچّے پیدا ہوتے ہیں اور 2,000 لوگ شادی کرتے ہیں۔

زمین اپنے مدار میں 66,000 میل کا سفر کرتی ہے۔

83 ٹن کائناتی گرد (دُھول) زمین پر گرتی ہے۔

3 ہلکے زلزلے آتے ہیں اور کہیں نہ کہیں کسی شخص یا عمارت پر بجلی گرتی ہے۔

بحری جہاز 6,000,000 میل اور ہوائی جہاز 11,000,000 میل کا سفر کرتے ہیں اور ایک گھونگا (Snail) صرف 30 گز چلتا ہے۔

وہ ہوا میں اُڑنے لگا

20 جون 1884 کی ایک صبح' امریکا کی ایک ریاست' کنساس' کا ایک شخص' رینارڈ بک' سو کر اُٹھا تو اُس کے پیر زمین پر نہیں لگے۔ اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسے ہوا میں اُچھال دیا ہے۔ وہ کافی دیر تک کمرے میں اُڑتا رہا اور پھر بڑی مشکل سے' دروازے اور الماری کو پکڑ کر' نیچے زمین پر آیا۔

لیکن جب اُس نے چلنے کی کوشش کی تو پھر اُڑنے لگا۔ شکر ہے کہ دروازہ بند تھا' ورنہ باہر نکل کر پتا نہیں کہاں چلا جاتا۔ آخر اُس کے بھائی' فرانک' نے رسّی کے ذریعے اُسے نیچے اُتارا اور اُس کی کمر میں ایک بھاری پتّھر باندھ دیا تاکہ اُڑ نہ سکے۔

فرانک بزنس مین تھا' اور ہر چیز سے پیسہ کمانے کی سوچتا تھا۔ اُس نے رینارڈ سے کہا کہ تم اپنے اِس کمال کو قُدرت کا تحفہ سمجھو اور اِس سے مال کماؤ۔ چُناں چہ اُنھوں نے ایک بڑا ہال کرائے پر لیا جس کے اندر رینارڈ ہوا میں اُڑنے کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جب وہ اُڑتا ہوا تماشائیوں کے سروں پر سے گزرتا تو وہ خوش ہو کر تالیاں بجاتے۔

بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ہال کی چھت میں مقناطیس لگے ہیں جو رینارڈ کو اُوپر کھینچتے ہیں۔ لیکن جب اُنھوں نے تحقیق کی تو اُن کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ سائنس دانوں نے بھی رینارڈ کی بے وزنی کی وجہ دریافت کرنے کی بہت کوشش کی' لیکن ناکام رہے۔ اِس عرصے میں رینارڈ نے خوب پیسہ کمایا۔

لیکن رینارڈ کے لئے قُدرت کا یہ تحفہ جہاں فائدہ مند تھا' وہاں ایک مستقل عذاب بھی تھا۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اُسے کُرسی سے باندھ دیا جاتا' اور جب سونے کے لئے لیٹتا تو اُسے پلنگ کے ساتھ رسّیوں سے جکڑ دیا جاتا۔ نہاتے وقت وہ اپنی ٹانگوں میں پتّھر باندھ لیتا تھا۔

اور پھر ایک دن قُدرت نے اپنا یہ تحفہ رینارڈ سے واپس لے لیا' اور وہ پھر پہلے جیسا عام آدمی بن گیا۔ لیکن اُس کی باقی زندگی بڑے آرام سے گزری' کیوں کہ اُس نے کافی مال کما لیا تھا۔

کیا امریکا کولمبس نے دریافت کیا تھا؟

آپ نے اپنی کورس کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ 1492ء میں' اٹلی کے ایک ملّاح کولمبس نے امریکا دریافت کیا تھا اور پُرانی دنیا کا یہ پہلا شخص تھا جو اِس نئی دنیا میں پہنچا تھا۔ لیکن کیا یہ بات سچ ہے؟

کم از کم 10 قومیں یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ امریکا کو دریافت کرنے کا اِعزاز اُنہوں نے حاصل کیا تھا۔ کولمبس تو بہت بعد میں وہاں گیا۔

ناروے کے لوگ کہتے ہیں کہ اُن کے سمندری ڈاکو' وائی کنگ' نے دسویں صدی میں شمالی امریکا کی سر زمین پر قدم رکھا تھا اور وہ اس علاقے کو "ون لینڈ" کہتے تھے۔

"آئرلینڈ کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ امریکا کو دریافت کرنے کا سہرا اُن کے پادریوں کے سر ہے۔ وہ' وائی کنگ سے 400 سال پہلے' وہاں عیسائی مذہب کی تبلیغ کرنے گئے تھے۔

برطانیہ کے ایک علاقے' ویلز' کے لوگوں کا کہنا ہے کہ امریکا کو ان کے ایک شہزادے' میڈوک' نے بارھویں صدی میں دریافت کیا تھا اور وہاں ویلز کے کچھ لوگوں کو لے جا کر آباد کیا تھا۔ اُس نے واپس آ کر بتایا کہ اِس نئی دنیا میں ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنے چہروں کو مختلف رنگوں سے رنگتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکا کو دریافت کرنے والے ریڈ انڈین ہیں۔ یہ لوگ آج سے 15,000 سال پہلے یورپ کے اُس علاقے سے امریکا گئے تھے' جسے آج ہم روس کہتے ہیں۔ یہ لوگ شکاری تھے اور چُوں کہ امریکا میں جانوروں کی بہتات تھی' اِس لئے وہ یہیں بس گئے۔

کانٹیبل یا اصطبل کا داروغہ

کانٹیبل پولیس والے کو کہتے ہیں۔ انگریزی کا یہ لفظ ایک مُردہ زبان' لاطینی' کے دو لفظوں Comes Stabuli سے بنایا گیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: اصطبل کا داروغہ۔ پُرانے زمانے میں روم کے بادشاہوں اور رئیسوں کے اصطبلوں کے اِنچارج کو "کومز اِسٹیبول" کہتے تھے۔

لانگ جمپ۔ ہائی جمپ

لمبی بار کر جیسا لمبی اور اُونچی چھلانگیں لگانے والا شخص دنیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ وہ انگلینڈ کے ایک شہر مانچسٹر کا باشندہ تھا' اور اُسے اپنے جسم پر غضب کا کنٹرول حاصل تھا۔ وہ نہر کے ایک کنارے سے چھلانگ لگاتا اور جب نہر کے اُوپر پہنچتا تو پانی پر زور سے پاؤں مار کر' بغیر گرے' دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا۔ اِسی طرح وہ اُلٹی چھلانگ بھی لگا سکتا تھا۔

وہ دو گھوڑا گاڑیوں کے اُوپر سے بھی چھلانگ لگاتا تھا' اور کبھی کسی گاڑی کے اوپر نہیں گرا۔ پہلی کا مارچ 1965ء میں' 84 سال کی عمر میں اِنتقال ہوا۔

داماد کے بجائے ساس

سِسلی کے ایک 56 سالہ شخص "انتونیو پر سیلی" کا اِنتقال ہو گیا۔ (سِسلی اٹلی کا ایک جزیرہ ہے) انتونیو کے رشتے دار' جن میں اُس کی بوڑھی ساس بھی شامل تھی' اُس کی لاش تابوت میں رکھ کر قبرستان لے گئے۔ پادری کی دعا کے بعد انتونیو کا تابوت قبر میں اُتارا جانے لگا تو وہ تابوت کا ڈھکنا کھول کر باہر نکل آیا۔ یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر انتونیو کی ساس پر دل کا دورہ پڑا اور وہ مر گئی۔

انتونیو کے کفن دفن پر اس کے رشتے داروں کے پانچ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ لیکن اُن کی یہ رقم ضائع نہیں گئی۔ انتونیو کی قبر میں اُس کی ساس کو دفن کر دیا گیا۔

دانائی کی باتیں

ڈاکٹر نصیر ناصر

دلچسپ اور سبق آموز کہانیاں

سنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچو! آج میں آپ کو چند ننھی منی کہانیاں سُنانا چاہتی ہوں۔ یہ کہانیاں مزیدار بھی ہیں اور نصیحت آموز بھی۔ غور کے کانوں سے سُنا اور سبق سیکھنا۔

کہتے ہیں کہ ایک جنگل میں دو بیل رہتے تھے۔ دونوں دوست تھے اور بڑے مزے سے اکٹھے جنگل میں رہتے تھے۔

اِتفاق سے ایک شیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے موٹے تازے بیلوں کو دیکھا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے ایک بیل کو دبوچنا چاہا تو بیل چوکنے ہو گئے۔ شیر حملہ کرنے لگتا تو دونوں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرتے۔ شیر بے بس ہو جاتا۔ وہ دو بیلوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تنگ آ کر اس نے سوچنا شروع کیا۔ اور پھر ان دونوں بیلوں میں پھوٹ ڈال کر انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی تدبیر سوچ لی۔ شیر نے ایک لومڑی سے دوستی کر لی' اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی کسی لومڑی کو نہیں کھائے گا' بشرطے کہ وہ میرا ایک کام کر دے۔

لومڑی خوش ہو کر بولی "شیر بادشاہ، حکم دیجئے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

شیر بولا "بی لومڑی' فلاں جگہ دو بیل رہتے ہیں۔ ان دونوں میں گاڑھی چھنتی ہے اور وہ کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ تم کسی طرح ان دونوں دوستوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو الگ الگ کر دو"۔

لومڑی بولی "میرے آقا! میرے لئے یہ کام مشکل نہیں ہے۔ میں آپ کے حکم کی جلد تعمیل کروں گی"۔

لومڑی مکاری کے لئے مشہور ہے۔ اس نے بیلوں سے دوستی کرنے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لئے اس نے بیلوں کی جھوٹی تعریفیں کرنا شروع کر دیں اور ان کے ساتھ رہنے لگی۔ آخر خوشامد اور چاپلوسی کر کے ان کو اپنا دوست بنا لیا۔ اس کے بعد اس نے دونوں دوستوں میں نا چاقی پیدا کرنے کی خاطر دونوں کے ایک دوسرے کے خلاف کان بھرنا شروع کر دیے۔ باتوں کے تیر کاری ہوتے ہیں۔ دونوں بیل ایک دوسرے سے بدظن ہو گئے اور ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ آخر کار لومڑی انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

لومڑی نے جب شیر کو بتایا کہ دونوں بیل ایک دوسرے سے ناراض ہو کر الگ الگ رہنے لگے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ایک دن ایک بیل پر حملہ کر دیا اور دبوچ کر لے گیا۔ اس کا گوشت سیر ہو کر کھایا۔ پھر اس نے دوسرے بیل کو دبوچ لیا اور اسے ہڑپ کر گیا۔

یہ کہانی سنا کر سنہری چڑیا بولی "پیارے بچو! یہ ہوتا ہے نا اِتفاق کا انجام۔ یہ مقولہ جتنا مشہور ہے اُتنا سچا بھی ہے کہ اِتفاق میں قوت اور برکت ہوتی ہے۔

اب میں ایک اور کہانی سُناتی ہوں۔

پاکستان بننے سے پہلے امرتسر کی چھاؤنی میں انگریز رہا کرتے تھے۔ یہ کہانی میں ایک انگریز افسر کی زبانی سناتی ہوں اس کا نام ولیم تھا۔ اس نے بتایا:

میرا ایک بیٹا ہے جس کی عمر اس وقت 6 سال تھی' جب میں امرتسر چھاؤنی میں رہتا تھا۔ میرا بنگلہ وسیع اور کشادہ تھا۔ اس میں ایک باغیچہ تھا' جس میں پھولوں کے پودے اور پھلوں کے درخت تھے۔ میرا بیٹا' جان' باغیچے میں کھیلنے کا شوقین تھا۔ سہ پہر کو ہم میاں بیوی

چائے پیتے اور جان کو دودھ دیتے۔

ایک دن ہم نے دیکھا کہ جان دودھ کا گلاس لے کر باغیچے میں چلا گیا ہے۔ ہم نے خیال نہ کیا۔ لیکن جب ایسا کرنا اس کا معمول بن گیا تو ایک دن میں نے چپکے سے اس کا پیچھا کیا اور دور سے اسے دیکھنے لگا۔ باغیچے کے ایک کونے میں گلاب کی گھنی جھاڑی تھی۔ جان اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک ناگ جھاڑی کے اندر سے نکلا اور جان نے اس کے سامنے دودھ کا گلاس کر دیا۔ ناگ دودھ پینے لگا۔ جب دودھ پی چکا تو تھوڑی دیر اپنے ننھے دوست کو دیکھتا رہا' اور پھر جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

جان خالی گلاس لے کر لوٹا۔ میں نے ظاہر نہ کیا کہ میں نے اسے ناگ کو دودھ پلاتے دیکھ لیا ہے۔ اس عجیب و غریب واقعہ کا ذکر میں نے اس کی ماں سے بھی نہ کیا۔

دوسرے روز' پھر اسی وقت جان دودھ کا گلاس لے کر باغیچے میں چلا گیا۔ اس کے جھاڑی کے پاس پہنچتے ہی ناگ نمودار ہوا اور گلاس سے دودھ پینے لگا۔ میں جان کی ماں کو بلا کر لایا اور اس سے کہا "آواز نہ نکالنا۔ چپکے سے یہ حیرت انگیز تماشا دیکھو۔ ایسا نہ ہو کہ ناگ بھڑک جائے اور بچے کو ڈس لے"۔

جان کی ماں نے یہ نظارہ دیکھا تو ڈر کے مارے دم بخود رہ گئی۔ ہم نے جان سے تو کچھ نہ کہا' لیکن دوسرے روز وہ بنگلہ چھوڑ دیا اور ذرا دور دوسرے بنگلے میں چلے گئے۔

اس بنگلے میں بھی باغیچہ تھا' جس میں پھولوں کی جھاڑیاں اور درخت تھے۔ جان چائے کے وقت حسب معمول دودھ کا گلاس لے کر باغیچے میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہی ناگ ایک جھاڑی میں سے نکلا اور جان کو دیکھنے لگا۔ جان نے جلدی سے دودھ کا گلاس اس کے سامنے رکھ دیا اور وہ بڑے آرام سے دودھ پینے لگا۔ جب دودھ پی چکا تو جھاڑی میں غائب ہو گیا۔

یہ دیکھ کر ہم نے ڈر کے مارے فوراً" واپس انگلستان جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یہ کہانی سنا کر سنہری چڑیا بولی:

پیارے بچو' محبت سے دشمن بھی رام ہو جاتے اور دوست بن جاتے ہیں لیکن کسی کو دکھ دینے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' سنیئے:

بنگلہ دیش میں ایک بہت بڑا جنگل ہے' جسے سندر بن کہتے ہیں۔ اس میں ہر قسم کے درندے' جانور اور سانپ پائے جاتے ہیں۔ ساری دنیا سے شکاری وہاں شکار کرنے کے لئے جاتے ہیں۔

انگلستان سے ایک شکاری اپنی بیوی کے ساتھ وہاں گیا اور ایک گاؤں میں قیام کیا۔ اس نے مکان کے باہر دو ناگ دیکھے۔ دہشت کے مارے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک ناگ کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ناگن نے بھاگ کر جان بچائی۔ پھر رات کو وہ اس کے مکان میں گھس آئی۔ وہ اپنے ناگ کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق سے شکاری نے اسے دیکھ لیا۔ اس نے بندوق اٹھائی تو وہ بھاگ گئی۔ دو چار مرتبہ ناگن نے اسے ڈسنے کی کوشش کی' لیکن شکاری کی ہوشیاری کی وجہ سے وہ ناکام ہو گئی۔ شکاری کی بیوی سخت خوف زدہ تھی۔ چناں چہ انہوں نے وہ گاؤں چھوڑ دیا اور دوسرے گاؤں میں چلے گئے۔ ایک دن شکاری شکار کھیلنے کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی کو ناگن نے ڈس لیا ہے اور وہ تڑپ رہی ہے۔ آخر کار وہ زہر کے اثر سے مر گئی۔

محمد یونس حسرت

بلیک گینگ

دوسری قسط

فضا میں کسی قدر دھند سی پھیلی ہوئی تھی اور اس دھندلی دھندلی فضا میں چیزیں مشکل ہی سے نظر آتی تھیں۔ مگر انسپکٹر حمید اور میرے لئے یہ دھندلی فضا کوئی معنی نہ رکھتی تھی۔ پولیس والے ہونے کی وجہ سے ہم تو اس سے بھی کہیں زیادہ گہری دھند میں مجرموں کا تعاقب کرنے کے عادی تھے۔ اس لئے جیسے ہی وہ شخص اپنے مکان سے نکلا' ہم مناسب سا فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

وہ شخص مختلف سڑکوں اور گلیوں سے ہوتا ہوا شہر کی دوسری طرف ایک کھلی جگہ جا پہنچا۔ یہ کھلی جگہ اصل میں ایک پرانی اور خستہ حال حویلی کا احاطہ تھی۔ حویلی ایک مدت سے ویران اور بے آباد چلی آ رہی تھی اور اس کے متعلق نہ جانے کیسے یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ یہاں بھوتوں کا بسیرا ہے اور یہ بھوت حویلی کے اندر رہنے والوں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس حویلی کے والی وارث اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کوئی اس حویلی کو خریدنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا۔ حویلی کی چار دیواری کبھی کی گر چکی تھی اور اس کا احاطہ ایک کھلی جگہ میں تبدیل ہو گیا تھا جہاں جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ اسی وجہ سے کوئی رات تو کیا' دن میں بھی اس حویلی کے قریب تک نہیں پھٹکتا تھا۔

مگر وہ شخص جو ہمارے آگے آگے نہایت آرام اور اطمینان سے جا رہا تھا' یوں قدم اٹھا رہا تھا جیسے وہ حویلی اس کی دیکھی بھالی ہو اور وہ اس جگہ سے اچھی طرح مانوس ہو----- مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ شخص جسے ہم برابر اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے'

یکایک کہیں غائب ہو گیا!

"ارے! کدھر گیا وہ؟" ایک دم میرے مُنہ سے نکلا۔

انسپکٹر حمید نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔ پھر ایک جگہ رکتے ہوئے بولے "وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ تم اس طرف دیکھو' میں اس طرف دیکھتا ہوں"۔

انسپکٹر حمید کی ہدایت کے مُطابق میں حویلی کی دوسری طرف بڑھ گیا۔ مجھے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ انسپکٹر حمید چند قدم آگے ہی بڑھے تھے کہ انہیں ایک ٹوٹی پھوٹی دیوار کے نیچے ایک گہرے تاریک سے سائے کا احساس ہوا۔ وہ اس دیوار کے قریب پہنچے اور قریب تھا کہ وہاں سے آگے بڑھ جاتے کہ انہیں پتا چلا کہ دیوار کے نیچے انہیں جو تاریک سایہ محسوس ہوا تھا' وہ سایہ نہیں تھا بلکہ ایک خاصا چوڑا شگاف یا دہانہ تھا جسے جھاڑیوں نے چھپا رکھا تھا۔

انسپکٹر حمید گھٹنوں کے بل جھک گئے اور کچھ سننے کی کوشش کی۔ پہلے تو انہیں کچھ سُنائی نہ دیا' پھر ان کے کانوں میں مدھم مدھم آوازیں سی آنے لگیں۔ یہ آوازیں اس شگاف کے اندر سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ انہوں نے ان آوازوں پر کان لگا دئے اور پھر ان کے چہرے پر سختی پیدا ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور ایک ہلکی سی سیٹی ان کے ہونٹوں سے نکلی۔

یہ سیٹی میرے لئے بُلاوے کا حکم تھی۔ میں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا اور بے چینی سے بولا "کچھ مل گیا' جناب؟"

"یقیناً مل گیا" انسپکٹر حمید نے جواب دیا "وہ آدمی ادھر نیچے ہے--- اس کے ساتھ دوسرے آدمی بھی ہیں۔ یہ پُرانے زمانے کی حویلی ہے۔ پُرانے زمانے کی عمارتوں میں تہ خانے ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں بھی کوئی خفیہ تہ خانہ ہے۔ بہرحال' خوشی کی بات یہ ہے کہ نیچے بلیک گینگ کے سارے آدمی جمع ہیں۔ میں نیچے چل کر دیکھتا ہوں۔ تم فون کر کے پولیس کے آدمی بُلالو"۔

"میرا خیال ہے' آپ اکیلے نیچے نہ جائیں" میں نے کہا "اس وقت تک انتظار کر لیں جب تک میں پولیس کو نہ لے آؤں"۔

"تم میری فکر نہ کرو' ارسلان" انسپکٹر حمید نے کہا "جو حکم دیا گیا ہے' اس کی تعمیل کرو۔ جاؤ!"

اب میرے لئے کسی چون و چرا کی گنجائش نہ تھی۔ میں پولیس کو بُلانے کے لئے آبادی کی طرف چل دیا اور انسپکٹر حمید اس شگاف میں داخل ہو گئے---- شگاف کے اندر داخل ہونے پر انہیں پتا چلا کہ وہ ایک زینے پر ہیں۔ اس زینے کی سیڑھیاں پتھر کی تھیں اور نیچے تہ خانے تک جاتی تھیں۔

انسپکٹر حمید نے ربڑ کے تلے والے جوتے پہن رکھے تھے' اس لئے ان کے چلنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی تھی۔ پہلے تو انہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا اور وہ اندھوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارتے رہے۔ لیکن جب وہ اندھیرے سے کچھ کچھ مانوس ہو گئے تو آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگے۔ ان کا جی تو چاہتا تھا کہ ٹارچ جلا کر روشنی کر لیں مگر ایسا کرنا احتیاط کے خلاف تھا۔ اس طرح ان لوگوں کو ان کے آنے کا پتا چل سکتا تھا اور سارا کھیل خراب ہو جانے کا ڈر تھا۔

انسپکٹر حمید آہستہ آہستہ' بڑی احتیاط سے' کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر نیچے اتر رہے تھے کہ ایک جگہ پہنچ کر ان کے قدم خود بخود رک گئے۔ شاید ان کی چھٹی حس نے انہیں خبردار کر دیا تھا کہ ان کے قریب ہی کوئی شخص موجود ہے۔ انہوں نے رُک کر دیکھنے کی کوشش

کی۔ انہیں دکھائی تو کچھ نہیں دیا مگر وہ کسی آدمی کے سانس لینے کی آواز ضرور سن رہے تھے---- پھر نیچے تہ خانے سے آتی ہوئی مدھم روشنی میں انہیں اس شخص کا ہیولا سا دکھائی دیا۔

صاف ظاہر تھا کہ اس شخص کو وہاں پہرے داری کے لئے کھڑا کیا گیا تھا تاکہ اوپر کی طرف سے کوئی آئے تو وہ آواز دے کر نیچے اپنے ساتھیوں کو خبردار کر دے۔ ایسے پہرے داروں سے نپٹنا انسپکٹر حمید کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے پیچھے پہنچے' اپنے ایک بازو کا حلقہ بنا کر اس کے گلے کو گرفت میں لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے مُنہ پر رکھ دیا تاکہ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اسے ذرا سا پیچھے کی طرف کھینچا تو وہ بے ہوش ہو کر نیچے ڈھیر ہو گیا۔

انسپکٹر حمید نے اسے نیچے لٹا کر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دی۔ پھر اپنی جیب سے وہ رسّی نکالی جو وہ ایسے ہی موقعوں کے لئے اپنے پاس رکھتے تھے۔ اُس رسّی سے انہوں نے پہرے دار کے سارے جسم کو اچھی طرح جکڑ دیا تاکہ اگر وہ ہوش میں آ جائے تو منہ سے یا جسم کو ہلا جلا کر کوئی آواز پیدا نہ کر سکے۔

اِس کام سے فارغ ہو کر وہ پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگے۔ ابھی وہ تہ خانے کے فرش سے چند سیڑھیاں اوپر ہی تھے مگر وہیں سے انہیں تہ خانے کا سارا منظر صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ وہیں رُک گئے اور نیچے دیکھنے لگے۔

تہ خانے کا منظر خاصا ڈراؤنا تھا۔ ایک برقی لیمپ کی روشنی تہ خانے کے فرش پر دائرہ بنا رہی تھی اور اس دائرے میں سیاہ نقاب پہنے ہوئے آٹھ آدمی ایک سیاہ نقاب پوش شخص کے گرد جمع تھے' جو یقیناً ان کا باس تھا۔ اس نے سیاہ نقاب کے علاوہ کہنیوں تک سیاہ دستانے بھی پہنے ہوئے تھے۔ اس کے گرد کل آٹھ آدمی تھے۔ نواں آدمی پہرے دار تھا اور شریف احمد کو شامل کرنے کے بعد دس کی گنتی مکمل ہو جاتی تھی۔ باس کہہ رہا تھا:

"فی الحال ہم یہاں آخری بار جمع ہوئے ہیں۔ جب سے 9 نمبر نے پولیس والوں کے سامنے زبان کھولی ہے' پولیس شکاری کتّوں کی طرح ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔ ایسے میں ہم جو کارروائی کر سکتے ہیں' وہ یہی ہے کہ کچھ عرصے کے لئے غائب ہو جائیں۔ اس لئے آج کے بعد جب تک کہ میری طرف سے کوئی حکم نہ ہو' بلیک گینگ کو ختم سمجھو۔ ہم اگرچہ اپنے اپنے گھروں میں اپنے اپنے کام کرتے رہیں گے مگر بلیک گینگ کے طور

پر موجود نہیں ہوں گے۔ پولیس والے اپنی ساری چالاکیوں کے ساتھ اس گینگ کا کھوج لگاتے رہیں گے اور ہم ان کی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہیں گے۔"

"ہم کب تک خاموش رہیں گے' باس؟" ایک نقاب پوش نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب ابھی نہیں دے سکتا" باس نے جواب دیا "ہو سکتا ہے ہم ایک سال تک خاموش رہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو سال تک خاموش رہیں۔ بہرحال' ہم نے جو آخری ہاتھ مارا تھا' اس میں سے تم سب کو اپنا اپنا حصہ مل چکا ہے۔ اگر 9 نمبر نے زبان نہ کھولی ہوتی تو ہمارے ہاتھ ڈھیروں سونا آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کو اس کا پورا حصہ دیا گیا ہے۔"

"ہمیں اس کے انجام پر کوئی افسوس نہیں باس!" ایک بھاری جسم کے' چھوٹے سے قد والے' نقاب پوش نے کہا "اسے اپنے کئے کا پھل مل گیا ہے۔ مگر ہمیں گینگ کے ختم کیے جانے کا افسوس ضرور ہے۔ کیا ہم اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے؟ میرا مطلب ہے کیا ہم ایک آدھ لمبا ہاتھ اور نہیں مار سکتے؟ کوئی بینک' کوئی اسٹور' یا کوئی اور ایسی جگہ جہاں سے ہمیں بھاری رقم ہاتھ آ سکے؟"

"نہیں!" باس کی آواز گونجی "ہم فی الحال کوئی ہاتھ نہیں ماریں گے۔ نہ لمبا' نہ چھوٹا۔ ہم کچھ دنوں کے لئے اپنا کام بند کر رہے ہیں۔ کیوں کہ پولیس والے ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ میں گھر بیٹھ کر آرام کروں اور یہ فیصلہ کروں کہ ہمیں کب تک خاموش رہنا ہے اور کب دوبارہ کام شروع کرنا ہے۔ اور کام دوبارہ اسی وقت شروع ہوگا جب میری طرف سے اس کا حکم دیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔ اس وقت تک سب لوگوں کو آرام سے گھر میں بیٹھنا ہوگا اور میرے حکم کا انتظار کرنا ہوگا۔"

انسپکٹر حمید سانس روکے اور دیوار سے پیٹھ لگائے ان کی گفت گو سن رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی تھی کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ انہوں نے بلیک گینگ کے باس کی آواز کو پہچان لیا ہے۔ ابھی وہ اگلا قدم اٹھانے کے بارے میں کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ اچانک وہ بات ہوئی جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

ان کے پیچھے اور اوپر سیڑھیوں پر' جہاں پہرے دار رسیوں میں جکڑا پڑا تھا' ایک گھٹی گھٹی سی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ انسپکٹر نے تو پہرے دار کے منہ پر بڑی مضبوطی سے ٹیپ لگا دی تھی اور ساتھ ہی اسے رسی سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ وہ منہ سے یا اپنے جسم کو ہلا کر کوئی آواز پیدا نہ کر سکے' مگر پہرے دار کوئی اناڑی آدمی نہ تھا۔ وہ بلیک گینگ ہی کا آدمی تھا اور انسپکٹر حمید کی تمام احتیاط کے باوجود اپنے ٹیپ لگے ہوئے منہ سے آواز پیدا کرنے کے علاوہ جسم کو ادھر ادھر ہلا کر شور پیدا کرنے میں بھی کام یاب ہو گیا تھا۔

"یہ کیا ہے؟ باس؟"

یہ کہتے ہوئے دو نقاب پوش سیڑھیوں کی طرف لپکے اور تیزی سے اوپر چڑھنے لگے۔ انسپکٹر حمید چاہتے تو یہی تھے کہ ان کے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو جائیں مگر ان کے لیے ایسا کرنے کا نہ موقع تھا اور نہ وقت۔ انہوں نے دائیں بازو کو پھیلا کر پہلے آدمی کی ٹھوڑی پر ایک زور دار مکا رسید کیا اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا دھڑام سے نیچے تہ خانے کے فرش پر جا گرا۔ اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر دوسرے آدمی نے پستول نکال لیا۔ انسپکٹر حمید نے ایک دم جھکائی دے کر اپنے سر سے اس کے پیٹ میں ٹکر ماری۔ وہ بھی دوہرا ہو کر

نیچے جا گرا اور اس کے ساتھ ہی انسپکٹر حمید سیڑھیوں سے چھلانگ لگا کر تہ خانے کے فرش پر آ کودے۔

اس سے پہلے کہ بلیک گینگ والوں کو صورت حال کا پوری طرح احساس ہوتا، انسپکٹر حمید بجلی کی سی تیزی سے باس کی طرف بڑھے اور اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے کر اس کی پیٹھ اس میز سے لگا دی جس پر بجلی لیمپ رکھا ہوا تھا۔ میز ایک دھچکے کے ساتھ الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی لیمپ چکر کھاتا ہوا دور جا گرا اور گرتے ہی بجھ گیا۔ تہ خانے میں ہر طرف تاریکی چھا گئی!

بلیک گینگ کے باقی آدمی شور مچاتے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انسپکٹر حمید نے اس شور کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ تو باس سے الجھے ہوئے تھے جو اندھیرے میں ان کی گرفت سے آزاد ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ وہ محض اندازے سے اس پر حملہ کر رہے تھے۔ کیوں کہ اندھیرے میں انھیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈاکوؤں کا باس طاقت میں ان سے کچھ کم نہ تھا، مگر وہ اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب میں پولیس کو لے کر وہاں پہنچا اور سپاہیوں کو ہدایات دیتا ہوا زینے سے نیچے اترنے لگا۔

ہماری آوازیں سن کر باس نے انسپکٹر حمید کی گرفت سے نکلنے کی آخری کوشش کی۔ اس نے انسپکٹر کو اوپر اٹھا کر نیچے پٹخنے کے لئے پورا زور لگایا اور ایک بار انسپکٹر کے پاؤں فرش سے اکھاڑنے میں کام یاب بھی ہو گیا۔ مگر انسپکٹر کوئی اناڑی کھلاڑی نہ تھے۔ انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے باس کے گلے کو مضبوطی سے پکڑا اور پھر اپنے سر سے اس کے سر پر اتنے زور سے ٹکر ماری کہ وہ بے سدھ ہو گیا اور انسپکٹر نے اُسے اُٹھا کر، آٹے کی بوری کی طرح، فرش پر پٹخ دیا۔

اتنے میں سارے پولیس والے تہ خانے میں آ پہنچے تھے۔ میں تو سیدھا انسپکٹر حمید کی طرف بڑھا تاکہ

باس کو قابو میں کرنے کے لئے ان کی مدد کروں اور باقی- پولیس والوں نے تھوڑی سی ہاتھا پائی کے بعد بلیک گینگ کے باقی آدمیوں کو گرفتار کر لیا--- چند منٹوں میں ساری کارروائی ختم ہو چکی تھی-

انسپکٹر حمید نے ٹارچ سے بھاری بھر کم باس پر روشنی ڈالی جو تہ خانے کے فرش پر بے ہوش پڑا تھا- وہ اس کی طرف اشارے کرتے ہوئے بولے:

"یہ ہے' باس! بلیک گینگ کا باس!"

"یہ ہے کون' جناب؟" میں نے پوچھا-

"ہمارا ایک پرانا دوست جو اسپیشل اسکواڈ میں ہمارے ساتھ کام کرتا رہا ہے"-

یہ کہتے ہوئے انسپکٹر حمید نے اس کے چہرے سے سیاہ نقاب اتار دیا- نقاب ہٹتے ہی نیچے سے جو چہرہ نمودار ہوا' وہ پولیس کے اسپیشل اسکواڈ کے ایک رکن حیدر علی کا چہرہ تھا- انسپکٹر حمید نے اس کے دستانے کھینچ کر ایک طرف پھینکے تو ان کے نیچے سے حیدر علی کی بالوں بھری وہ کلائیاں نمودار ہوئیں جن پر کہنیوں تک بیل بوٹے گدے ہوئے تھے اور جن کی وجہ سے وہ ہزاروں کے مجمعے میں بھی نمایاں نظر آتا تھا-

اگلے روز جب بلیک گینگ کے سارے آدمی اپنے باس حیدر علی سمیت جیل کی مضبوط سلاخوں کے پیچھے بند ہو چکے تھے' انسپکٹر حمید نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا:

"مسٹر ارسلان' میں شروع ہی سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس گینگ کا لیڈر ہماری اپنی پولیس ہی کا کوئی آدمی ہے' اور ہمارے اسپیشل اسکواڈ کے آدمیوں میں سے ہی کوئی ایک ہے- شریف احمد کے قتل کے بعد میرا یہ شبہ اور پکا ہو گیا تھا کیوں کہ صرف اسپیشل اسکواڈ ہی کو علم ہوتا تھا کہ ہم کیا کارروائی کرنے والے ہیں یا کیا کارروائی کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں- پھر جب شریف احمد نے گینگ کے باس کے متعلق یہ بتایا کہ وہ سیاہ نقاب کے علاوہ ایسے لمبے سیاہ دستانے بھی پہنتا ہے جو اس کی کلائیوں کو کہنیوں تک چھپائے رکھتے ہیں تو میرا خیال حیدر علی کی طرف گیا- صاف ظاہر ہے کہ جس طرح سیاہ نقاب کا مقصد چہرے کو چھپانا ہوتا ہے' اسی طرح لمبے سیاہ دستانوں کا مقصد ہاتھوں اور کلائیوں کو چھپانے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا- چناں چہ وہ دستانے صرف اس لیے پہنتا تھا کہ کھلے ہاتھوں کی وجہ سے پہچانا نہ جائے- اس کے علاوہ یہ دستانے اس کے گینگ کے آدمیوں کے لئے ان کے باس کی علامت بھی تھے- کیوں کہ سیاہ نقاب تو وہ سارے ہی پہنتے تھے' مگر ان کا باس سیاہ نقاب کے علاوہ سیاہ دستانے بھی پہنتا تھا- پھر شریف احمد نے باس کے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ اونچے قد اور بھاری جسم کا آدمی ہے- یہ بات بھی حیدر علی کے قد کاٹھ پر پوری بیٹھتی تھی- پھر یہ بات بھی میرے علم میں تھی کہ حیدر علی ایک خاص قسم کے تمباکو والے سگرٹ پیتا ہے- اس بنگلر میں جب ہمیں شریف احمد کی لاش ملی تو وہاں تمباکو کی بو بھی محسوس ہوئی تھی اور وہ اسی خاص تمباکو کی بو تھی جس کے سگرٹ حیدر علی پیتا تھا-

اتنا کہہ کر انسپکٹر حمید رکے اور چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے "اور سب سے آخری بات جس نے میرے شک کو سو فی صد یقین میں بدل دیا' وہ اس رسی کے ٹکڑے میں لگی ہوئی پھسلنی گرہ تھی جس کے ذریعے شریف احمد کو گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا- ظاہر میں وہ سادہ سی گرہ تھی' مگر وہ سادہ سی گرہ بھی کوئی ماہر آدمی ہی لگا سکتا تھا- حیدر علی یقیناً اس کام کا ماہر تھا' کیوں کہ اس نے چند سال ایک بحری جہاز میں کام کیا تھا اور بحری جہاز پر کام کرنے والے لوگ رسیوں میں ہر طرح کی گرہیں لگانے کے

ماہر ہوتے ہیں۔ جب میں نے ان ساری باتوں کو اپنے ذہن میں جمع کیا تو ان سب کا اشارہ حیدر علی کی طرف تھا۔ چناں چہ میں نے اُس کی نگرانی کرنے اور اُس پر کڑی نظر رکھنے کا فیصلہ کیا"۔

انسپکٹر حمید ایک بار پھر دم لینے کے لئے رُکے۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہنے لگے:

"میں نے اپنا منصوبہ اِس طرح ترتیب دیا کہ حیدر علی اِسپیشل اِسکواڈ کے دوسرے آدمیوں کے ساتھ نگرانی کی ڈیوٹی کرنے پر مجبور ہو جائے اور اسے فارغ وقت کم سے کم ملے۔ اس فارغ وقت میں بھی میں اس کی کڑی نگرانی کرتا تھا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ اس فارغ وقت ہی میں وہ اپنے گینگ کے آدمیوں کی میٹنگ بلائے گا ----- میں نے اسکواڈ کے دوسرے آدمیوں کی جو ڈیوٹیاں لگائی تھیں، وہ محض خانہ پری کے لئے تھیں اور ان کا مقصد صرف حیدر علی کو مصروف رکھنا تھا۔ اسی لیے میں نے اس روز تم سے کہا تھا کہ چار گروپ تو اسکواڈ والوں کے ہیں اور پانچواں گروپ ہم دونوں کا ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اصل کام ہم دونوں ہی کا تھا--- اب تو سمجھ گئے ناں؟"

"سمجھ گیا، جناب!" میں نے جواب میں کہا "مگر میں تو یہی عرض کروں گا کہ یہ کام ہم دونوں کا نہیں ہے۔ آپ کا اور صرف آپ کا ہے۔ بلیک گینگ کے آدمیوں کی گرفتاری کا سہرا آپ کے اور صرف آپ کے سر ہے۔ میں تو صرف آپ کے چھوٹے موٹے احکام کی تعمیل کرتا رہا ہوں"۔

"یہ بھی بڑی اہم بات ہے" انسپکٹر حمید نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "چھوٹے موٹے کام بھی اگر ٹھیک سے اور وقت پر نہ ہوں تو بڑے کام بھی بھرپور کوشش کے باوجود ادھورے رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اس کام میں تمہارا حصہ بظاہر حقیر ہونے کے باوجود نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انسپکٹر حمید کو کامیابی اس لئے ہوئی ہے کہ ارسلان اس کے ساتھ تھا--- یہ بات نہ میں بھول سکتا ہوں اور نہ تمہیں بھولنی چاہیے"۔

آپ جانتے ہیں؟

☆ دنیا میں گلاب کی 15,000 قسمیں کاشت کی جاتی ہیں۔

☆ ہرن اور اُونٹ کے جسم میں پتّا نہیں ہوتا۔

☆ پتّا ایک چھوٹا سا، ناشپاتی کی شکل کا، عضو ہے جو جگر کے نچلے حصّے کے ساتھ ہوتا ہے۔ جگر میں بننے والا صفرا یا پت جگر کی نالی کے ذریعے پتّے میں آ کر جمع ہوتا ہے اور کھانے کے ہضم میں مدد دیتا ہے۔ پتّے کا کام پانی کو جذب کرنا اور پت کو گاڑھا کرنا ہے۔

☆ کچھوؤں کے دانت نہیں ہوتے۔

☆ ہاتھی کے 4 گھٹنے ہوتے ہیں۔

☆ گرگٹ سر گھمائے بغیر دائیں بائیں اور پیچھے کی طرف دیکھ سکتا ہے۔

☆ زرافہ بھی سر گھمائے بغیر پیچھے کی طرف دیکھ سکتا ہے۔

☆ 420 واحد نمبر ہے جو ایک سے لے کر 7 تک کسی بھی ہندسے پر تقسیم ہو سکتا ہے۔

☆ مگرمچھ آنکھیں کھول کر سوتے ہیں۔

☆ مچھلیوں کی آنکھوں کے پپوٹے نہیں ہوتے۔ ان کی آنکھیں، سوتے جاگتے، ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔

آیئے مسکرائیں!

ایک اندھی کھجور کے پیڑ کے نیچے لیٹا کہہ رہا تھا: "ہے کوئی اللہ کا بندہ جو میرے منہ میں ایک کھجور ڈال دے؟"

ایک راہ گیر نے اُس کے منہ میں ایک کھجور ڈال دی۔ جب وہ جانے لگا تو اندھی بولا "ارے میاں، گٹھلی تو نکالتے جاؤ"۔ (حمیرا حسین، لاہور)

اُستاد (شاگرد سے): ترقی یافتہ ملکوں میں بچّے 15 سال کی عمر ہی میں اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شاگرد (حیرت سے): لیکن سر، اِس میں ترقی یافتہ ہونے کی کون سی بات ہے۔ ہمارے ہاں تو ایک سال کا بچّہ بھاگنے لگتا ہے۔ (محمد عمران بشیر انصاری، راہ والی)

ایک مداری تماشا دکھا رہا تھا۔ اُس نے تماشائیوں میں سے ایک لڑکے کو بُلایا اور کہا "اے لڑکے! بتاؤ، تم میرے رشتے دار تو نہیں ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا "نہیں، ابّا جان"۔ (ایس۔ طاہر حسن، کوٹل ٹاؤن کوہاٹ)

لڑکا (ڈاکٹر سے): آپ کے پاس درد کی دوا ہے؟

ڈاکٹر: درد کہاں ہو رہا ہے؟

لڑکا: جی، وہ آدھ گھنٹے بعد ہوگا جب ابّو میرا رزلٹ کارڈ دیکھیں گے۔ (فیصل شہزاد، عبداللہ پور فیصل آباد)

بیٹا (باپ سے): ابّو، میں کب اِتنا بڑا ہوں گا جب امّی مجھے ڈانٹنا چھوڑ دیں گی؟

باپ: بیٹے، اِتنا بڑا تو اب تک میں بھی نہیں ہوا۔ (مسعود احمد سومرو، گڈو بیراج)

ایک شخص کو پاگل کتّے نے کاٹ کھایا۔ وہ کافی عرصہ ہسپتال میں رہا۔

ایک دن ڈاکٹر نے اُس سے کہا "میرے خیال میں اب آپ ٹھیک ہو چکے ہیں۔ آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟"

وہ شخص بولا "ویسے تو میں ٹھیک ہوں، بس کبھی کبھی بھونکنے کو جی چاہتا ہے"۔ (آکاش بدرُالدین عباسی، گڈو بیراج)

ایک بہت موٹے آدمی نے درزی سے کہا "کمال ہے! تم مجھ سے شیروانی کی سلائی 500 روپے مانگ رہے ہو، جب کہ اِس کی سلائی 100 روپے ہونی چاہیے"۔

درزی بولا "میں نے شیروانی نہیں سی ہے، شامیانہ سیا ہے"۔ (اکرام خالد تبسم)

باپ (مُنّے سے): بیٹے، تم بڑے ہو کر کیا ہو گے؟

مُنّا: ابّو، میں بڑا ہو کر دُولہا ہوں گا۔ (اروبا جارج، لاہور)

داؤدی علمی آزمائش

خالی جگہ پر کیجیے۔
یہ جملے اسی شمارے میں چھپی ہوئی تحریروں سے لیے گئے ہیں۔
1- اُس نے ایک دن ایک ـــــــ پر حملہ کر دیا۔
2- انسپکٹر حمید نے ایک دم ـــ دے کر اپنے سر سے اُس کے پیٹ میں ٹکر ماری۔
3- وہ سارے ـــــــ فضول سے تھے۔
4- جب ہماری باری آئی تو ہم بھی ایک ـــ میں سوار ہو گئے۔
5- ہمارا ـــــــ مسلسل کنٹرول کر رہا تھا۔
6- ـــــ نہ گئی تو پیچھے رہ جاؤں گی۔
7- اِس کے برخلاف ـــــ نہایت نیک اور تمیز دار بچّہ تھا۔
8- یہ ـــــ عمران کے لئے عجیب و غریب تھا۔
9- باقی سپاہیوں نے گھر کو ـــــ رکھا تھا۔
10- حج اِسلام کا ـــــ رکن ہے۔

پہلا انعام	(بالکل صحیح حل)	350	روپے کی کتابیں
دوسرا انعام	(ایک غلطی)	300	روپے کی کتابیں
تیسرا انعام	(دو غلطیاں)	200	روپے کی کتابیں
چوتھا انعام	(تین غلطیاں)	150	روپے کی کتابیں

جواب علمی آزمائش مارچ 1996ء

(1) ارشد کے ذہن پر اُس "معذور شخص" کی بات نے بہت اثر کیا۔ (2) کھیل اور تفریح سے جسم "چُست" ہوتا ہے۔ (3) بلی کو "رمضان" کا مہینا بہت اچھا لگتا تھا۔ (4) اب "روزے" شروع ہو گئے تھے۔ (5) اِس رسم کو "گیرن گاؤ" کہتے ہیں۔ (6) یہ "واردات" ہوائی اڈے پر ہو گی۔ (7) مجھے "معطّل" کر دیا گیا ہے (8) بیگم زاہد "شیر خُرمہ" تیار کر چکی تھیں۔ (9) اِس طالب علم کی "زندگی کے" یہ بہت خراب دن تھے (10) ماں باپ گر ہوں زندہ تو کوئی "غم" نہیں ہے۔

اِس ماہ 4076 بالکل درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے پہلے 50 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی 20،20 روپے کی کتابیں دی گئی ہیں۔ باقی..... ساتھیوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی شائع کئے جا رہے ہیں۔

حارث محمد اسلام آباد۔ اقبال خان خٹک رحیم یار خان۔ فاروق ارشد اوکاڑہ۔ سدرہ جہانگیر لاہور۔ میمونہ سحر اصغر رائے بہاول پور۔ عمارہ طاہر کمبوہ حافظ آباد۔ عمران نثار منڈی بہاء الدین۔ مدیحہ طارق لاہور۔ اسما سلطان لاہور۔ محمد قاسم ایبٹ آباد۔ عظمت فاطمہ میرپور۔ محمد حسن قادر آباد۔ شاہد منظور ڈیرہ غازی خان۔ عامر شہزاد سرائے صالح۔ عرفان وحید بہاول پور۔ خالد محمود گوجرانوالہ چھاؤنی۔ محمد ذی شان بن نذیر فیصل آباد۔ رباب زین لاہور۔ عامر آفتاب سرگودھا۔ شاہدہ خواجہ لاہور۔ القصیٰ عبدالرزاق قصور۔ سدرہ عارف حافظ آباد۔ محمد سلیم اعوان پوٹہ۔ شگفتہ سحر رشید بورے والا۔ علی عمران خان پشاور۔ عفیفہ خبیب کالا گوجراں۔ وسیم راحیل راہ والی چھاؤنی۔ رانا پرویز شاہد بہاول نگر۔ فائزہ فاطمہ فیض لاہور۔ خدیجہ شکر اللہ بوتالہ شرم سنگھ۔ وجیہہ حسن زیدی لاہور۔ کاشف رشید چودھری ساہی وال۔ حنا ارشد لاہور۔ محمد عدنان شاہد لاہور۔ غلام فاطمہ کھاریاں۔ شہباز علی لاہور۔ حسن جلیل لاہور۔ علی حسن سکھیرا لاہور۔ محمد ابراہیم نفیس صفدر ساہی وال۔ محمد آصف خان پشاور۔ صبا ارشد لاہور چھاؤنی۔ محمد اعجاز حسین ڈیرہ غازی خان۔ بخت علی تخی سرور۔ بلال مغل صادق آباد۔ دجلہ صبا سرگودھا۔ محمد سلمان لاہور۔ محمد علو احسان ربوہ۔

قرۃ العین نزہت کوٹ عبدالمالک۔ عائشہ ارشد رحیم یار خان۔ وقاص محمد فیصل آباد۔ فرح یاسمین فیصل آباد۔ بخش زمرد اسلام آباد۔ محمد خبیب لطیف جھنگ صدر۔ صومیہ شہزادی سیال کوٹ۔ ریحان گل فیصل آباد۔ مہران آصف کھاریاں۔ عبدالباسط لون مظفر آباد۔ اسماء اشفاق لاہور۔

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 7 اپریل ہے۔

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- ایمپریس روڈ لاہور

نام ــــــــــــ عمر ــــــــــــ

پتا ــــــــــــــــــــــــ

تنزیلہ الرحمان راول پنڈی۔ سحرش ریاض اسلام آباد۔ سونیا لطیف سیال کوٹ۔ مدیحہ اصغر لاہور۔ تنویر احمد رحیم یار خان۔ محمد ظفر ڈیرہ غازی خان۔ افراح ادریس گوٹھ ماچھی۔ مبشر احمد مرزا رحیم یار خان۔ شاشار لاہور۔ سمیہ ہاشمی کراچی۔ سائرہ تسنیم فیصل آباد۔ محمد آصف ملی جھنگ صدر۔ جمال میراں لاہور۔ خواجہ عبدالباسط رحیم یار خان۔ کلیم اللہ خان اسلام آباد۔ نازیہ ناصر رحیم یار خان۔ میمونہ حمید رحیم یار خان۔ آئلہ عاشق راول پنڈی۔ ندیم اقبال رحیم یار خان۔ عروج قسیم لاہور۔ عروبہ عثمان شیخ لاہور۔ اظہر علی خان بنوں۔ افتخار حسین مسعد کھوہ۔ عطیہ رشید راول پنڈی۔ عمار محمود رانا گکھڑ منڈی۔ مریم آصف لاہور۔ صفیرا قسیم خان کاہنہ نو۔ ایوب احمد نجی سرور۔ وحید عزیز ایبٹ آباد۔ راحیل فاروق عبدالکبیر۔ مریم جبار کراچی۔ احسن الحق لطیف آباد۔ عبدالسلام مغل راول پنڈی۔ عمران احمد عباسی اسلام آباد۔ مریم صبا اسلام آباد۔ آمنہ انور لاہور۔ سدرۃ الساره راول پنڈی۔ ارم بتول چشمہ بیراج۔ سید عمیر عباس رضوی۔ اسامہ منیر راول پنڈی چھاؤنی۔ محمد شاہ نواز احمد بہاول پور۔ وسیم شاہد فرخ کندیاں۔ عمارہ اجمل لاہور۔ محمد عثمان فاروق شور کوٹ۔ نادیہ سعید ہارون آباد۔ فراز محسن اسلام آباد۔ راحیل مجاہد گڑھی عطا خان۔ طارق محمود چک بختاور۔ حماد رفیع قریشی بہاول نگر۔ محمد شعیب حسن لاہور۔ محسن علی حیدر آباد۔ ظفر اقبال فیصل آباد۔ ایس زی شان ریاض فیصل آباد۔ محبہ بیگم فتح جنگ۔ بلقیس آرا تخت بھائی۔ تنویر احمد فیصل آباد۔ مفتی احتشام ساہی وال۔ خواجہ مظہر عباس لیہ۔ حافظ محمد عرفان ریاض جھنگ صدر۔ ایمن نور اکاڑہ۔ عظیم سلیم عارف والا۔ عثمان ناصر آرائیں رحیم یار خان۔ سحرش مقصود بہاول پور۔ ذکاء الرحمان خانیوال۔ فرحانہ ظہور مانسہرہ۔ حافظ سدرہ انور نارو وال۔ جویریہ حنا فیصل آباد۔ سعدیہ فیاض لاہور۔ صفدر حسین منگیرہ۔ حفصہ بدر جہلم۔ فوزیہ ریاض چک نمبر 44/2.L شاہ بدر اوکاڑہ۔ آمنہ سہیل لاہور۔ نمتی فیصل آباد۔ محمد زبیر رانا گوجرانوالہ چھاؤنی۔ نعمت اللہ چاچڑ گدو بیراج۔ ظفر محمود گدو بیراج۔ مدیحہ ضیا سیال کوٹ۔ مبشر رفیع سیال کوٹ۔ وقاص اصغر پٹہ منڈی۔ شہناز کوثر سیال کوٹ۔ ندا جمشید بہاول پور۔ میمونہ اشرف پشلہ کالونی۔ عصمت بتول بہاول پور۔ عائشہ عرفان لالہ موسیٰ۔ وردہ نیاز لاہور۔ حافظ محمد یاسین گڈو شالہ۔ سعدیہ اقبال سیال کوٹ۔ رابعہ شاہد سرگودھا۔ عائشہ فاروق خٹک لاہور۔ قرۃ العین سعید جہلم۔ مرہانی گوجرانوالہ۔ عدیلہ بھٹی کھوکھر کی۔ طیب علی اٹک۔ میاں محمد نعیم اختر فاروق آباد۔ حنا انور شیخوپورہ۔ یاسمین خلیل لاہور۔ طاہرہ سکین لاہور۔ محمد چاند لاہور۔ سطین اقبال راول پنڈی۔ فیصل علاء الدین لاہور چھاؤنی۔ ملک عبدالحسیب لاہور۔ مریم بشیر لاہور۔ نمرہ بشیر لاہور۔ محمد عثمان نقشبندی پاک پتن۔ عثمان غنی سرگودھا۔ ہما خان لاہور۔ محسن سلطان علی لالہ موسیٰ۔ فاطمہ ریاض شور کوٹ چھاؤنی۔ سارہ حفیظ کراچی۔ محمد عارف گوجرہ۔ یاسر جمال دھارو وال۔ ثوبیہ عبدالخالق سیال کوٹ۔ عنبرین عالم خانپور۔ ارسلان احمد صادق آباد۔ بجش اعجاز بٹ سیال کوٹ۔ آکاش بدر الدین عباسی گدو بیراج۔ محمد یعقوب منڈی بہاء الدین۔ زاہد نثار صادق آباد۔ ملک محمد خضر حیات ظلی ریالہ خوردہ۔ محمد ارقم لاہور۔ فیصل جہلم۔ محمد احسن سلیم خان لاہور۔ محمد جاوید تبسم مہار شریف۔ زی شان داؤد جنجوعہ کھاریاں چھاؤنی۔ عمر اعجاز بٹ سیال کوٹ۔ فرزانہ رفیق ڈیرہ اسماعیل خان۔ کرن عائشہ سرور فیصل آباد۔ ثنا شاہد لاہور۔ عائشہ ظفر کراچی۔ صدف خالد سیال کوٹ۔ ناصر ظفر اسلام آباد۔ عنبرین افضل لاہور۔ رابعہ احمد قریشی لاہور۔ غضنفر علی ناز حافظ آباد۔ مدیحہ حسن بہاول پور۔ ناصر سعید لاہور۔ بلال کامران میاں چنوں۔ بلال اعجاز سامریا لاہور۔ محمد احتشام فرخ لاہور۔ کومل منیر لاہور۔ ارم حفیظ لاہور۔ مہ وش اکرم لاہور۔ طارق محمود رائے ونڈ۔ زہرہ گلنار صابری لاہور۔ شفیق ندیم فیصل آباد۔ بلی لاہور۔ محمد عثمان ادریس لاہور۔ نگینہ ادریس لاہور۔ روما نورین لاہور چھاؤنی۔ مدیحہ اشرف ملک لاہور۔ رابعہ افضل بٹ وزیر آباد۔ روزینہ صدف لاہور۔ انجم سہیل مغل اوکاڑہ۔ شازیہ نسرین فیصل آباد۔ جویریہ حسین لاہور۔ سکینہ لیاقت لاہور۔ زینب محبوب لاہور۔ نادیہ انور لاہور۔ شعیب حمید لاہور۔ ماجین احمد لاہور۔ جہانگیر شبیر لاہور۔ عثمان ارشد لاہور۔ محمد عمر لاہور۔ نعیم ماجد بہاول پور۔ نعمان سلیم بٹ گوجرانوالہ۔ افتخار احمد گوجرانوالہ۔ عمر لطیف ملک سیال کوٹ۔ مہ وش مقصود احمد لاہور۔ قرۃ العین پشاور۔ ظہیر عباس کشمیری میانوالی۔ محمد شعیب کوہاٹ چھاؤنی۔ سلمان انور اسلام آباد۔ وسیم حیدر لاہور۔ عمران رحیم خان بہاول نگر۔ محمد امجد شاہد ساہی وال۔ عطاء المصطفےٰ جمیل حویلی لکھا۔

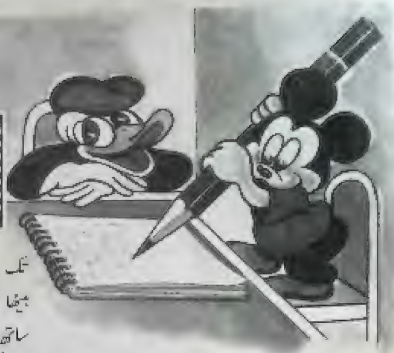

آپ بھی لکھیے

ایسے بھی حکمران تھے کبھی

محمد معروف چشتی، حویلی لکھا

مسلمانوں کے چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک عرب بدو (دیہاتی) کا اونٹ مر گیا۔ وہ لمبے سفر کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا مدینہ منورہ پہنچا تاکہ امیرالمومنین حضرت علیؓ سے بیت المال کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ حاصل کرے۔

وہ بدو امیرالمومنینؓ کے مکان پر آیا تو آپ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ آپ کے صاحب زادے حضرت امام حسینؓ اس کی حالت سے سمجھ گئے کہ وہ لمبا سفر کر کے آیا ہے اور بہت تھکا ہوا ہے۔ وہ اُسے مسجدِ نبویؐ میں لے گئے اور عمدہ اور لذیذ کھانا تیار کرا کے اُس کے سامنے رکھا۔ اتنی دیر میں امیرالمومنینؓ بھی باہر سے تشریف لے آئے اور مسجدِ نبویؐ کے ایک کونے میں جا کر روٹی کے سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگو کر کھانے لگے۔

یہ دیکھ کر بدو نے حضرت امام حسینؓ سے کہا: "میں تو ایسا عمدہ کھانا اُس وقت تک نہیں کھاؤں گا، جب تک وہ غریب شخص بھی، جو مسجد کے اُس کونے میں بیٹھا سوکھی روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے، میرے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوتا۔ میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میں خود تو اچھا کھانا کھاؤں اور میرا مسلمان بھائی روکھی سوکھی پر گزارہ کرے"۔

حضرت امام حسینؓ نے بدو کی یہ بات سن کر جواب دیا "جس شخص کو تم ایک غریب شخص سمجھ رہے ہو، یہی تو میرے والد اور امیرالمومنین حضرت علیؓ ہیں۔ یہی ان کی روزانہ کی خوراک ہے۔ یہ لذیذ کھانا نہیں کھائیں گے"۔

بدو امیرالمومنینؓ کی یہ سادگی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ شخص جو اتنی عظیم سلطنت کا مالک ہے، ایسی غذا کھا رہا ہے جو کسی غریب سے غریب شخص کے حلق سے بھی نہیں اُتر سکتی۔ بعد میں بدو نے حضرت علیؓ سے اونٹ حاصل کیا اور خوش خوش اپنے وطن کو لوٹا۔ سبحان اللہ! (پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)۔

فرشتہ

زاہدہ پروین، گوجرانوالہ چھاؤنی

"جمال، ایک ٹافی مجھے بھی دے دو" میں نے اپنے لہجے کو ہر ممکن حد تک میٹھا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی جمال سے درخواست کی۔

"میں کیوں دوں؟' آپ مجھے کوئی چیز دیتی ہیں؟" اُس نے بڑی مُرکھائی سے کہا۔

یہ سُن کر مجھے اُس کی ذہنی حالت پر شُبہ ہوا کہ ابھی رات ہی کو تو اِس نے مجھ سے لالی پاپ لے کر کھایا تھا۔ "کیا اِس کی یادداشت کھو گئی ہے؟" میں نے سوچا۔

"دیتی تو ہوں۔ کل رات لالی پاپ نہیں دیا تھا؟" میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصّے پر قابو پا کر کہا۔

"وہ تو لالی پاپ تھا۔ ٹافی تو نہیں تھی ناں" وہ ڈھیٹ بھی ہمارا ہی بھائی تھا۔ کسی طرح مان ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن میں نے بھی ہار نہیں مانی اور ایک دفعہ پھر مکھن لگایا! "تم تو میرے اچھے بھائی ہو ناں' ایک ٹافی دے دو' اپنی باجی کو"۔

"بھائی بھی کبھی کچھ دیتے ہیں بہنوں کو؟ بھائی تو لیتے ہیں"۔ اس کا یہ انوکھا اصول سُن کر مجھے اُس کے پاگل ہونے کا یقین ہو گیا۔

اِس کے بعد بھی میں بہت دیر تک کوشش کرتی رہی' کافی اِنرجی ضائع کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں پیار سے دھمکیوں پر اتر آئی۔

"ٹھیک ہے" میں نے پاؤں پٹخا "یاد رکھنا! تم نے مجھے ٹافی نہیں دی تھی۔ اب آنا میرے پاس لالی پاپ مانگنے۔ جوتا دوں گی آگے سے"۔

یہ کہ کر میں اپنے کمرے میں آئی اور زور سے دروازہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

جمال کی عمر پانچ سال ہے۔ شاید طوطے کی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور غلطی سے ہمارے گھر آ گیا ہے۔ اتنی جلدی آنکھیں پھیر لیتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی جمال ہے جو رات باجی' باجی کرتا نہیں تھک رہا تھا۔ اب یہ کوئی پہلی دفعہ تو نہیں ہوا۔ پہلے بھی ایک دفعہ اِسی طرح ہوا تھا تو میں نے اِرادہ کر لیا تھا کہ اب اسے بالکل کچھ نہیں دوں گی۔ لیکن جب میں نے چیونگ گم منگوائے تو اس نے اتنی معصوم شکل بنا کر مانگے کہ دیئے بغیر نہ رہ سکی۔ اور اب اس کا حال دیکھو۔

"ہونہہ! بدتمیز!" میں نے اُسے نئے لقب سے نوازا۔

اُسی لمحے دروازہ کُھلا اور جمال اندر داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی میرے تھرما میٹر کا پارہ پھٹ پڑا اور میں زور سے چیخی "نکل جاؤ میرے کمرے سے! خبردار جو اِدھر آئے!"

"باجی" اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن میں پھر گرجی "میں نے کہا ناں' نکل جاؤ میرے کمرے سے!" اور وہ باہر چلا گیا۔ اب میں نے سوچا کہ ابھی کچن میں جا کر چپس بناؤں گی اور یہ جب آئے گا مانگنے کے لئے تو ڈانٹ کر بھگادوں گی۔ اسی وقت دوبارہ دروازہ کُھلا اور جمال مُسی مُسی سی صورت بنائے اندر داخل ہوا۔

"اِنتہائی ڈھیٹ ہو تم بھی" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"باجی....." وہ بڑے پیار سے بولا "ناراض ہیں آپ مجھ سے؟"

"ہاں' ناراض ہوں۔ اور میں نہیں تمہاری باجی واجی"۔

وہ ذرا آگے بڑھا اور جیب سے ایک ٹافی نکال کر بولا "باجی' یہ لے لیں"۔

میں چُپ رہی۔ اُس نے ایک اور ٹافی نکالی اور کہا "باجی' یہ دونوں لے لیں۔ لیکن ناراض نہ ہوں"۔

"میں بھلا ناراض ہو سکتی ہوں اپنے ننھے مُنّے بھائی سے؟"

اُس کا افسردہ چہرہ کِھل اُٹھا اور اُس وقت وہ مجھے معصوم فرشتے کی طرح لگا۔ (دوسرا انعام 45 روپے کی کتابیں)

بُرائی کا انجام

قدیر محمد خٹک' چراٹ صالح خانہ

یہ واقعہ میرے ایک عزیز دوست اختر زمان خٹک کے ساتھ پیش آیا۔ آیئے' اُسی کی زبانی سُنیئے۔

"میں چراٹ صالح خانہ کے ہائی اسکول سے گھر واپس جا رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ میرے چند دوست' محمد نواز' سراج ولی' لیاقت علی' انور زمان اور محمد علی وغیرہ غلیل سے چڑیوں کا شکار کر رہے ہیں۔ ان کی یہ حرکت مجھے بہت بُری لگی۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ میرا مذاق اڑانے لگے۔

محمد نواز نے کہا کہ اختر زمان خٹک' تم بے حد ڈرپوک ہو۔ شکار تو بہادر لوگ کرتے ہیں۔ میں نے اُن کو سمجھایا کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں بلکہ رحم دل ہوں اور مجھے ان چھوٹی چھوٹی معصوم چڑیوں کا شکار پسند نہیں۔ ہاں' ان خطرناک جانوروں کے شکار سے مجھے ضرور دل چسپی ہے جو انسان کے دشمن ہیں اور جن سے عام طور پر انسان کو نقصان پہنچتا ہے۔

اس کے باوجود میرے دوست باز نہ آئے اور وہ غلیل سے معصوم چڑیوں کو مارتے رہے۔ میں گھر آ کر خاصی دیر تک اداس رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنے دوستوں کو اس ظلم سے کیسے روکوں۔

دوسرے دن جمعرات تھی اور جمعرات کے روز ہمارے اسکول میں آدھی چھٹی ہوتی تھی۔ جب چھٹی ہوئی تو انور نے سب دوستوں سے کہا کہ بھئی آج گھر چلنے کی بجائے پارک میں چلتے ہیں۔ سیر کا سُن کر سب دوست پارک جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے بھی دعوت دی' اور میری جو شامت آئی تو میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ راستے میں ایک کھیت پڑا' جو فرید بابا کھیت کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑا سا درخت بھی ہے۔ ہم اس کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ میرے دوست سراج ولی کی نظر اس درخت کی ٹہنی پر بیٹھی ہوئی ایک خوب صورت چڑیا پر پڑی۔ اس کے پروں کے رنگ بہت حسین تھے۔ اسے دیکھتے ہی میرے دوست کھل اٹھے اور اس کو مارنے کے درپے ہو گئے۔

محمد علی نے غلیل تانی اور اس کا نشانہ بنایا۔ لیکن پتھر ابھی غلیل سے نکلا بھی نہ تھا کہ چڑیا اڑ گئی۔ لڑکوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اب تو محمد علی کو غصّہ آ گیا۔ وہ تیزی سے چڑیا کے پیچھے بھاگا۔ دوسرے لڑکے بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک گھنے درخت کی ٹہنی پر انہیں وہ رنگین چڑیا نظر آ گئی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ انہیں اس غلط کام سے روکوں لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ انہوں نے کہا کہ چلو' سب مل کر اس پر حملہ کرتے ہیں۔ دیکھیں' کیسے بچ کر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی غُلیلوں سے پتھر نکل کر چڑیا کی طرف تیزی سے گئے۔ لیکن اُسی لمحے چڑیا پھُر سے اُڑ گئی۔ اور اس سے پہلے کہ ہم اُس کا تعاقب کرتے' ایک عجیب بات ہوئی۔

ہمیں یوں لگا جیسے اُن گنت چیونٹے ہمیں چمٹ گئے ہیں۔ ہماری جان نکلی جا رہی تھی۔ ہم الٹے قدموں گھر کی طرف بھاگے۔ لیکن پُر اسرار چیونٹے برابر ہمارا پیچھا کرتے رہے۔

دراصل ہوا یوں کہ جس درخت کی ٹہنی پر چڑیا بیٹھی تھی' اس پر شہد کی مکھیوں کا ایک چھتّا تھا۔ لڑکوں نے بغیر دیکھے بھالے اندھا دھند غلیلیں چلائیں' جس پر جُھنجلا کر شہد کی مکھیوں نے ہم پر حملہ کر دیا۔

اِس واقعے کے بعد کئی دنوں تک ہمارے خاص کر محمد نواز اور محمد علی کے ہاتھ پاؤں سُوجے رہے اور ہمیں بہت تکلیف اٹھانی پڑی۔ اُس دن کے بعد میرے سب دوستوں نے شرارتوں سے توبہ کر لی۔

اس واقعے کو میں اب بھی یاد کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں (تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

سچی خوشی

محمد عمران، راہ والی

جوں ہی مارچ کا مہینا ختم ہونے کو آیا، میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ کل 31 مارچ کا دن تھا، اور جو میں نے بویا تھا وہی مجھے کاٹنا تھا۔ دن جلد ہی گزر گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ امی نے کہا "بیٹا! ابو کھانے کی میز پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا کھا لو۔ میں نے کھانا لگا دیا ہے"۔ کھانے کی میز پر پہنچا تو ابو اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔

"بیٹا! میں تمہارا اِنتظار کر رہا تھا" ابو نے اخبار کرسی پر رکھتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد میں نے ابو سے پوچھا "آپ کو اپنا وعدہ یاد ہے ناں؟ کہیں بھول تو نہیں گئے؟"

"نہیں، میرے بیٹے۔ مجھے یاد ہے۔ اگر تم نے فسٹ پوزیشن حاصل کی تو تمہیں سائیکل لے کر دوں گا"۔

امی بولیں "اِن شاء اللہ میرا بیٹا فسٹ آئے گا"۔

ابو کہنے لگے "چلو، اب جا کر سو جاؤ۔ صبح اِسکول جانا ہے"۔

میں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح فجر کی اذان نے مجھے بیدار کیا۔ سامنے روشن دان میں، ایک چڑیا میٹھی چوں چوں کر رہی تھی، جیسے کہ رہی ہو کہ عمران، تم فسٹ آئے ہو۔ جلدی سے میں نے وضو کیا اور جا نماز بچھائی۔ پھر نماز پڑھنے کے بعد گڑگڑا کر دعا مانگی "یا اللہ! میری فسٹ پوزیشن آئے"۔

اس کے بعد میں نے یونی فارم پہنا اور کھانے کی میز پر آ گیا۔ ناشتے کے بعد اسکول روانہ ہو گیا۔ اسکول کے ہال میں داخل ہوا تو میری نظر اسٹیج پر پڑی جسے بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ پھر اسمبلی کے لیے قطاریں بننے لگیں۔ اسمبلی کا آغاز تلاوت سے ہوا۔ تلاوت کے بعد علامہ اقبال کی نظم پڑھی گئی۔ اِس کے بعد سکنڈ ہیڈ ماسٹر صاحب رزلٹ سنانے لگے۔ دو لڑکوں کے بعد میرا نام آیا "محمد عمران بشیر، جماعت ہشتم اے کا طالب علم، فسٹ آیا ہے"۔ اسٹیج پر جا کر میں نے ماسٹر صاحب کو سلام کیا اور انعام حاصل کیا۔

اب مجھے گھر جانے کی جلدی تھی۔ گھر پہنچا تو امی نے میرا ماتھا چوما اور ابو نے کہا "چلو، تمہاری سائیکل لینے چلتے ہیں"۔

"اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ابو باہر گئے اور پھر واپس آ کر کہنے لگے کہ کشمیری مُجاہدین کے لیے چندہ جمع کرنے والے آئے ہیں۔ یہ سن کر میں نے فیصلہ کیا کہ سائیکل کے پیسے کشمیر فنڈ میں دے دیے جائیں۔ چناں چہ میں نے ان کو سارے پیسے دے دیے تاکہ کشمیری مجاہدین ان پیسوں سے اسلحہ خرید کر بھارتی فوج کا مقابلہ کر سکیں۔ آج مجھے ایک سچی خوشی ملی تھی۔ (چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)۔

ہماری ہو شامت آئی

عادل خان آف نوپی

ساتھیو، آج ہم آپ کو اپنا ایک دُکھ بھرا واقعہ سُناتے ہیں۔ ہوا یوں کہ اُس روز ورلڈ کپ میں پاکستانی ٹیم کا مقابلہ ہالینڈ کی ٹیم سے تھا۔ ہم نے بیماری کا بہانہ کر کے اسکول سے چھٹی کر لی اور میچ دیکھنے لگے۔ ابھی پندرہ اوور کا میچ ہوا تھا کہ ہماری خالہ آ گئیں اور انھوں نے ہم سے گوشت لانے کی فرمائش کی۔ ہم ٹالتے رہے، لیکن وہ نہ مانیں۔ مجبوراً ہم کو جانا پڑا۔ جب ہم قصائی کی دکان پر پہنچے تو ہمارا اُوپر کا سانس اُوپر اور نیچے

کا نیچے رہ گیا۔ آپ کہتے ہوں گے کہ اِس پر کیا مصیبت آن پڑی۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں - وہاں اِتنا رش تھا کہ چھوٹے بچّے بڑوں کے پیروں کے نیچے پِس رہے تھے۔ ایک ذبح کیا ہوا بیل ایک تیر سے لٹک رہا تھا۔ اُس سے اتنی خوش بو آ رہی تھی جیسے عطرِ گلاب۔ نہیں نہیں جیسے..... خیر یہ تو آپ خود ہی جانتے ہوں گے۔

ہمیں آئے تھوڑی دیر ہوئی ہو گی کہ ایک موٹا سا لڑکا، گنڈیریاں چوستا ہوا، آیا اور ہمارے آگے کھڑا ہو گیا۔ ہم بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ ہم اس سے گتھم گتھا ہو گئے۔ آخر ایک بزرگ نے بڑی مشکل سے ہم دونوں کو چھڑایا۔ خیر، اُس دکان کو تو ہم نے خیر باد کہا اور ایک دوسری دکان پر گئے۔ وہاں ایک گھنٹا کھڑے ہونے کے بعد جب ہمارا نمبر آیا تو گوشت ختم ہو گیا۔ اُس علاقے میں گوشت کی کوئی اور دکان نہ تھی، اِس لئے ہم مُنہ لٹکائے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہماری جیب میں کچھ پیسے تھے اور سامنے ایک چاٹ والا کھڑا تھا۔ ہم اُس کے پاس گئے تو اُس نے ہمیں اِس طرح گھور کر دیکھا جیسے وہ ہم ہی ہوں جس کی اُسے تلاش تھی۔ خیر، چاٹ کھانے کے بعد خالی ہاتھ گھر آئے اور سارا واقعہ خالہ کو سُنایا۔ اُنھوں نے خوب ڈانٹا۔ جب ہماری نظر دادی کے پاس رکھے ہوئے سُرخ سُرخ سیبوں پر پڑی تو ہمارے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ ابھی ہم نے ایک سیب اٹھایا ہی تھا کہ ہمارے گال پر ایک زور دار تھپّڑ پڑا۔ ہم بلبلا اُٹھے۔ جب ذرا ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ حرکت ہماری دادی کی تھی۔

خیر، اب ہم ٹی وی لاؤنج میں گئے اور ٹی وی لگایا۔ لیکن یہ کیا؟ بجلی ہی نہیں تھی۔ ہم واپڈا کو کوستے ہوئے پلنگ پر لیٹ گئے۔ اُس دن ہمیں اپنی قسمت پر بہُت رونا آیا اور ہم نے عہد کیا کہ آیندہ کبھی اِسکول سے چھٹی نہیں کریں گے۔ ساتھیو، آپ بھی بہانہ کر کے اِسکول سے چھٹی نہ کریں ورنہ آپ کی بھی ہماری جیسی حالت ہو گی۔ (پانچواں انعام : 30 روپے کی کتابیں)

نیکی

فیصل شاہ، گلستان کالونی راول پنڈی

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میں پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک دن میں صبح سویرے اُٹھا، مُنہ ہاتھ دھویا، وضو کیا اور نماز پڑھی۔ پھر ناشتا کیا اور اسکول جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ میری والدہ نے مجھے دس روپے کا نوٹ دیا اور کہا "بیٹا! ہمیشہ نیک کام کیا کرو"۔

میں نے والدہ سے وعدہ کیا کہ میں آپ کی نصیحت پر عمل کروں گا۔ یہ کہ کر اِسکول چلا گیا۔ چھٹی کے بعد باہر نکلا تو شدید گرمی پڑ رہی تھی اور سورج سوا نیزے پر تھا۔ میرے ماتھے سے پسینا پانی کی طرح ٹپک رہا تھا۔ میں نے اِسکول کا نل کھول کر پانی پینا چاہا تو اُس میں پانی نہیں تھا۔ میں نے مالی سے پوچھا "نل کیوں نہیں چل رہا؟" تو اُس نے جواب دیا "ٹنکی میں پانی نہیں ہے"۔

یہ سُن کر میں چُپ چاپ وہاں سے نکلا اور گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں بازار پڑتا تھا۔ گرمی کی شِدّت سے میرا دم گُھٹ رہا تھا۔ اچانک میری نظر مِلک شیک اور مینگو جوس کی دکان پر پڑی۔ میں نے خوشی خوشی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر یہ کیا؟ جیب میں دس روپے تو کیا ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا۔

میں بہت پریشان ہوا۔ مگر اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ پیاس سے گلا سوکھ رہا تھا۔ سر جھکائے چلتا گیا اور بازار سے دور نکل گیا۔ میری نظریں نیچے زمین پر تھیں کہ یکایک مجھے ایک کالے رنگ کا پرس دکھائی دیا جو زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور کھول کر دیکھا تو اُس میں 100، 100 روپے کے پانچ نوٹ تھے۔

اُس میں ایک شناختی کارڈ اور ڈاکٹر کا ایک نسخہ بھی تھا۔ شناختی کارڈ پر شیخ عبدالقیوم کا نام لکھا ہوا تھا۔

میں نے وہ پرس جیب میں رکھا اور دل میں سوچا کہ آگے جو بازار آئے گا تو وہاں سے جوس پیوں گا۔ ابھی دس پندرہ قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک بوڑھا دکھائی دیا جو فٹ پاتھ پر بیٹھا رو رہا تھا۔ مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ میں نے اس بوڑھے کی طرف توجّہ نہ کی اور آگے بڑھ گیا۔ لیکن اس وقت مجھے اپنی والدہ کی نصیحت یاد آ گئی کہ بیٹا ہمیشہ نیک کام کیا کرو۔ میں واپس مڑا اور اس بوڑھے کے پاس گیا تو مجھے اس کی شکل کچھ جانی پہچانی سی لگی۔

میں سوچنے لگا کہ اِسے میں نے کہاں دیکھا ہے۔ یکایک یاد آیا کہ شناختی کارڈ پر اِس کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ میں نے بابا جی سے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں تو اُنھوں نے جواب دیا "میرا پرس گُم گیا ہے۔ اس میں پانچ سو روپے اور میری بیوی کا نسخہ تھا۔ میری بیوی سخت بیمار ہے"۔

بابا جی کی یہ بات سُن کر میرا دل موم کی طرح پگھل گیا اور میں نے اُن کا پرس واپس کر دیا۔ بابا جی نے میرا شکریہ ادا کیا اور دعا دی۔

گھر آ کر میں نے یہ بات اپنے والدین کو بتائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ آج بھی جب میں اپنی اِس نیکی کو یاد کرتا ہوں تو مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ (چھٹا انعام : 25 روپے کی کتابیں)

ہائے یہ اپریل فول!

عائشہ خان، مندو خیل

میں چچا کے گھر بیٹھی تعلیم و تربیت پڑھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اُٹھایا اور کہا "ہیلو! آپ کون بول رہی ہیں؟"

اُدھر سے جواب ملا "میں ہاجرہ بول رہی ہوں"۔

ہاجرہ میری کزن کا نام ہے۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا "ہاجرہ، خیر تو ہے؟ اِتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

اُس نے کہا "ہمارے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس طرح لگی ہے۔ ہم نے فائر بریگیڈ کو بلایا ہے۔ وہ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

میں نے جلدی سے رسیور کریڈل پر رکھا اور بھاگی بھاگی باورچی خانے میں گئی۔ چچی اس وقت کھانا بنا رہی تھیں۔ میں نے ان کو ساری بات بتائی۔ انہوں نے چچا کے دفتر فون کیا۔ تھوڑی دیر میں چچا آ گئے اور ہم سب ان کی گاڑی میں بیٹھ کر ہاجرہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

تقریباً دس منٹ بعد ہم ہاجرہ کی گلی میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں کوئی فائر بریگیڈ کی گاڑی نہیں ہے اور نہ گھر میں آگ لگی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میری کزن ہمیں دیکھ کر زور زور سے ہنس رہی تھی۔

ہم نے پوچھا کہ آگ کہاں لگی ہے تو اُس نے اور زور سے ہنسنا شروع کر دیا اور پھر کہنے لگی "آج اپریل کی پہلی تاریخ ہے۔ میں صبح سے امی سے کہہ رہی تھی کہ عائشہ کے گھر چلتا ہے۔ لیکن امّی ٹال رہی تھیں۔ چُناں چہ میں نے آپ لوگوں کو اِس بہانے بُلایا"۔ مجھے اُس پر بہت غصّہ آیا۔ اُس نے ہمیں اِتنا پریشان کیا تھا۔

ہم ہاجرہ کے گھر چلے تو گئے، لیکن مجھے بہت افسوس ہوا۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ مسلمان بھی اپریل فول منا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائی سے جھوٹ بول کر اُس کو بے وقوف بناتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں۔

(ساتواں انعام : 20 روپے کی کتابیں)

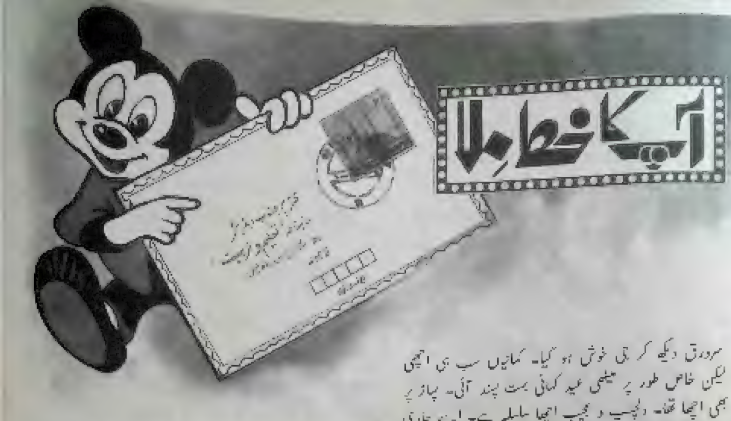

آپ کا خط ملا

سرورق دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ کہانیاں سب ہی اچھی تھیں۔ لیکن خاص طور پر میٹھی عید کہانی بہت پسند آئی۔ پہاڑ پر مضمون بھی اچھا تھا۔ دلچسپ و عجیب اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ "عیدی بڑھائی جائے" نظم بھی بہت بہت بلکہ بہت ہی پسند آئی۔ (عبدالوحید۔ میرپور خاص)

سرورق اچھا تھا۔ کہانیوں میں نئی عید' بلیک گینگ' لالچ کا بھوت' طالب علم کی شان' ہپ ہپ ہرے اور میٹھی عید پسند آئیں۔ نظموں میں عیدی بڑھائی جائے پسند آئی۔ دلچسپ و عجیب بھی بہت پسند آیا (ہما مقبول' سعدیہ مقبول' جلال پور جٹاں)

بسم اللہ سے ابتدا ہے میری
سدا سلامت رہے تعلیم و تربیت یہ دعا ہے میری

اس ماہ بھی تعلیم و تربیت نے دوسرے رسالوں کو شکست دے دی اور ورلڈ کپ جیت لیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور نظموں کے تو کیا کہنے۔ لطائف بھی نہایت دلچسپ تھے۔ (عطیہ باقی' سیٹلائٹ ٹاؤن راول پنڈی)

مارچ کا رسالہ عید کے بعد ملا۔ بہت اچھا تھا۔ کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔ البتہ چچا بھلکڑ نظر نہیں آئے۔ (عائشہ رفیق' شاہدرہ لاہور)

اس دفعہ کے شمارے کا سرورق بہت خوب صورت تھا۔ نئی عید' لالچ کا بھوت' طالب علم کی شان اور میٹھی عید کہانیاں بہت پسند آئیں۔ نظم عیدی بڑھائی جائے بالکل جائز مطالبہ ہے۔ درس قرآن کا سلسلہ بھی ہمیں بہت پسند ہے۔ (عمر لطیف' داو چھاؤنی)

کہانیوں میں بلیک گینگ' لالچ کا بھوت' طالب علم کی شان' سونیا' ریچھ اور ہرنی اور میٹھی عید پسند آئیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ دل چسپ اور عجیب سے معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔ (محمد عمران' محمد خالد' مصری شاہ لاہور)۔

کہانیوں میں نئی عید' بلیک گینگ' لالچ کا بھوت' طالب علم کی شان' میٹھی عید' ہپ ہپ ہرے اور عرفان' قطر اور عید بہت اچھی اور دلچسپ تھیں۔ عید کی خوشیاں مبارک اور عیدی بڑھائی جائے نظمیں بھی اچھی تھیں۔ ورلڈ کپ پر مضمون بھی دلچسپ تھا۔ (محمد عثمان' راولپنڈی)

مارچ کا شمارہ حسب معمول مارچ سے تین دن قبل ہی مل گیا۔ ایک ایک کر کے تمام کہانیاں پڑھ ڈالیں۔ سب کی سب پسند آئیں۔ لطائف بھی عمدہ تھے۔ (سائرہ صفدر' ڈیرہ غازی خان)

مارچ کا تعلیم و تربیت لاجواب تھا۔ کہانیوں میں بلیک گینگ' لالچ کا بھوت' ہپ ہپ ہرے اور نظموں میں "ماں باپ کی محبت" بہت اچھی تھی۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ ورلڈ کپ' مضمون' میٹھی عید اور قدرت کے عجوبے بہت لاجواب تھے۔ (سید وقاص علی شاہ' بالو ضلع نوشہرہ)

ہم ہر ماہ باقاعدگی سے تعلیم و تربیت پڑھتے ہیں اور ہمیں یہ رسالہ بہت پسند ہے۔ ہونہار فوٹو گرافر کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ لیکن پتہ نہیں آپ کو ہم سے کیا دشمنی ہے کہ ہماری بھیجی ہوئی کوئی بھی تحریر شائع نہیں کرتے۔ (آسیہ جبار' فہیم اشرف' سعدیہ جبار' فرحان اشرف اور نوید احمد' ظفر آباد بہاری کالونی ڈیرہ اسماعیل خان)

کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ خاص کر لالچ کا بھوت' ہپ ہپ ہرے اور عرفان' قطر اور عید بہت پسند آئیں۔

نظموں میں "عیدی بڑھائی جائے" بہت پر لطف ہے۔ غرض پورا رسالہ ایک شاہ کار ہے۔ (فرحانہ خلیل' ماڈل کالونی کراچی)

مارچ کا رسالہ بہت ہی اچھا تھا' رنگ برنگ کہانیوں سے بھرا ہوا۔ کہانیوں میں بچی عید' لالچ کا بھوت' میٹھی عید' عرفان قطر اور عید اور موتیا' ہرنی اور ریچھ بہت پسند آئیں۔ عیدی بڑھائی جائے اور ماں باپ کی محبت نظمیں بھی پسند آئیں۔ (اختر منصور' مسرت منصور' محمد احمد' گلبرگ لاہور)

سرورق' جو ورلڈ کپ کے حوالے سے تھا بہت پسند آیا کہانیوں میں سب سے اچھی عرفان قطر اور عید کی آخری قسط تھی۔ دوم "چپ چپ مزے" اور سوم بچی عید تھی۔ باقی کہانیاں بھی معیاری تھیں۔ (عائشہ ارشد' رحیم یار خان)

مجھے تعلیم و تربیت بہت بہت پسند ہے۔ میں اسے تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ اس ماہ مجھے بچی عید چپ چپ مزے اور طالب علم کی شان کہانیاں بہت پسند آئیں۔ (افشاں یاسین موہنی روڈ' لاہور)

اس دفعہ کہانیوں میں بلیک کینگ' طالب علم کی شان' عرفان' قطر اور عید اور میٹھی عید کہانیاں بہت پسند آئیں۔ یہ بہت سبق آموز اور دل چسپ تھیں۔ نظموں میں "عیدی بڑھائی جائے" بہت زبردست تھی۔ دلچسپ اور عجیب کا سلسلہ بہت ہی اچھا ہے۔ اس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ (عفیفہ نسیب' کالا گوجراں)

میں بازار سے گزر رہا تھا کہ اچانک میری نظر تعلیم و تربیت پر پڑی۔ میں نے اسے خریدا اور گھر جا کر پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ تمام کہانیاں لاجواب تھیں۔ (محمد عمران اعوان' ہنوں)

مارچ کا رسالہ سب گھر والوں کو بہت پسند آیا۔ سب ہی کہانیاں اچھی تھیں۔ نظموں میں عیدی بڑھائی جائے اور ماں باپ کی محبت پسند آئیں۔ سرورق بھی پسند آیا۔ (اطہارہ اجمل' لاہور)

اس دفعہ کا ٹائٹل بہت ہی خوب صورت تھا۔ کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ (روزینہ صدف' ٹھوکر نیاز بیگ لاہور)

مارچ کے شمارے میں ورلڈ کپ 1996ء شیڈول دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو بھی عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ (ایم یاسین سالک' مون لائٹ اسکول عارف والا)

ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہے۔ اگر کمپوزنگ کا پوائنٹ چھوٹا کر دیا جائے تو مزید تحریریں جگہ پا سکیں گی۔ (راحیل قریشی' جی پوسٹ آفس حیدر آباد)

مارچ کا شمارہ دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی۔ کسی بھی سلسلے میں میرا نام نہیں تھا۔ خیر' چھوڑیے اس بات کو۔ مارچ کا تعلیم و تربیت نہایت دل کش تھا۔ کہانیوں میں بچی عید' بلیک کینگ اور میٹھی عید مزے دار تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ (الوحید اسلم' گوجرانوالہ)

تعلیم و تربیت ہمیں بہت دیر سے ملتا ہے کبھی دو تاریخ کو اور کبھی چار تاریخ کو۔ اس لئے ہم "دماغ لڑاؤ" کے سلسلے میں شرکت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا گزارش ہے کہ اس کی آخری تاریخ 7 سے بڑھا کر 12 یا 15 کر دیں۔ (سارہ حفیظ' ناظم کراچی)

سرورق نہایت ہی شان دار تھا۔ بچی عید' بلیک کینگ' اور چپ چپ مزے اچھی کہانیاں تھیں۔ (محمد خرم میانہ' ثمینہ جہانگیر' محمد نعمان میانہ' ملتان)

تمام کہانیاں اچھی تھیں' خاص طور پر بچی عید' لالچ کا بھوت' اور چپ چپ مزے۔ لطائف بھی مزے دار تھے۔ سرورق بھی اچھا تھا۔ نظموں میں "عیدی بڑھائی جائے" اچھی لگی۔ (اسامہ احمد' حمزہ احمد' عرشیہ احمد' فیصل آباد)

آپ کے رسالے کی قیمت بہت کم ہے لیکن کہانیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اور تمام کہانیاں معیاری ہوتی ہیں۔ (عفرات سندس' علامہ اقبال ٹاؤن لاہور)

یہ میں کوئی چھٹی دفعہ خط لکھ رہی ہوں۔ خیر' مارچ کا رسالہ بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں بچی عید' بلیک کینگ' لالچ کا بھوت' موتیا' ریچھ اور ہرن' عرفان' قطر اور شادی پسند آئیں۔ نظم "ماں باپ کی محبت" بھی اچھی تھی ورلڈ کپ 1996ء اور ڈپٹی نذیر احمد کے بارے میں مضمون بھی اچھا تھا۔ (اختر صدیقی' ملتان)

سرورق رسالے کی جان تھا۔ کہانیاں اور نظمیں بھی بہت ہی پیاری اور دل چسپ تھیں۔ غرض مارچ کا شمارہ ہر طرح سے پر لطف تھا۔ (وقار علی محمد سلطان نون' جھنگ صدر)

ورلڈ کپ کے حوالے سے سرورق نہایت عمدہ تھا۔ نظم عیدی بڑھائی جائے بہت پسند آئی۔ ماں باپ کی محبت' عید کی خوشیاں مبارک بھی زبردست تھیں۔ کہانیوں میں بلیک کینگ' بچی عید' اور طالب علم کی شان اپنی مثال آپ تھیں (علی گوہر مغل' سول لائن گوجرانوالہ)

کہانیاں بھی اچھی تھیں' لیکن سب سے زیادہ اچھی کہانی چپ چپ مزے تھی۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔ (فہمیدہ محمد فاروق' کراچی)

مارچ کے رسالے کی تمام تحریریں لاجواب تھیں۔ رسالہ عید کے دن ملا۔ جس سے خوشیاں دوگنی ہو گئیں۔ انکل' کیا ہم بہن بھائی اپنی تحریریں ایک ہی لفافے میں بھیج سکتے ہیں؟ (عائشہ

افتخار، گوال منڈی لاہور)

آ بھیج سکتے ہیں۔ لیکن تمام تحریریں الگ الگ کاغذوں پر لکھی ہوئی ہوں اور ہر تحریر کے اوپر لکھنے والے کا نام اور پتا لکھا ہوا ہو۔ (ادیٹر)

کہانیوں میں اشتیاق احمد کی کہانی "لالچ کا بھوت" سر فہرست رہی۔ صفحہ 63 پر پانچویں لائن میں 11 ہزار کی جگہ 1 ہزار چھپ گیا ہے۔ غلطی نوٹ فرمالیں۔ (کامران اسرار خان، کراچی)

ٹائٹل پر گینڈ کو ٹیلنٹ پہنچے دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ ورلڈ کپ کا شیڈول بڑے خوب صورت انداز میں ترتیب دیا گیا ہے۔ بہترین کہانی "پچی عید" اور بہترین نظم "عیدی بڑھائی جائے" ہے۔ (محمد وسیم یوسف، جھنگ)

اس دفعہ سب سے اچھی کہانی "پچی عید" تھی۔ واقعی پاکستان کے ہر بچے کو ہمیشہ سچی عید ہی منانی چاہیے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ ورلڈ کپ کا مضمون بھی اچھا تھا۔ نظموں میں سب سے اچھی نظم "ماں باپ کی محبت" تھی۔ (یسین گیلانی، ماڈل ٹاؤن لاہور)۔

اس ماہ کا شمارہ امتحانوں کے دوران میں ملا۔ لیکن پھر بھی پڑھا۔ کیوں کہ میرے پیپروں کی تیاری مکمل تھی۔ کہانیاں اور نظمیں ساری ہی اچھی تھیں۔ (ایمان کوثر، رضوانہ کوثر، راول پنڈی)

جیسا رسالے کا نام ہے، ویسا ہی اس کا کام ہے۔ بے شک یہ ایک اچھے طالب علم کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اس سے ہماری تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ آپ نے عید کو باسی کہا ہے۔ عید گزر جانے کے بعد عید باسی تو نہیں ہو جاتی۔ تمام کہانیاں روشن روشن تھیں۔ خصوصاً" میٹھی عید، طالب علم کی شان اور پچی عید (ظہیر عباس کشمیری، میاں والی)

نظم "عیدی بڑھائی جائے" قابلِ داد تھی۔ "پچی عید" ایک روایتی کہانی تھی۔ "بلیک گینگ" کا سسپنس بہت بڑھ چکا ہے اور اس کے لئے اگلے ماہ کا شدت سے انتظار ہے۔ موتیا، ہرنی اور ریچھ بھی ایک اچھی کہانی تھی۔ کم از کم مجھے تو اس سے بہت اچھا سبق ملا۔ (رابعہ قریشی)

سرورق کا جواب نہیں۔ اتنا خوب صورت سرورق" واہ بھئی واہ! کہانیوں میں پچی عید، لالچ کا بھوت، ہپ ہپ ہُرے، اور میٹھی عید بے حد اچھی لگیں۔ نظموں میں عیدی بڑھائی جائے اور ماں باپ کی محبت عمدہ تھیں۔ (محمد اشرف گھانچی، لیاری کراچی)

میں نے اب تک بچوں کے جتنے رسالے بھی پڑھے ہیں۔ ان میں تعلیم و تربیت سب سے معیاری رسالہ ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بھی بہت دل چسپ تھا۔ سرورق بھی بہت خوب صورت تھا۔ (آئینہ قیصر، فرخندہ قیصر، گجرات)

سرورق انتہائی دل کش تھا۔ کہانیوں میں پچی عید، لالچ کا بھوت اور موتیا ریچھ اور ہرنی بہت پسند آئیں۔ درس قرآن کا مضمون بھی بہت اچھا تھا۔ نظمیں، لطائف بھی بہت پیارے تھے۔ (امبشر احمد شاہد، وحرکنہ)

مارچ کا تعلیم و تربیت پوری آب و تاب کے ساتھ ملا، اور گزری ہوئی عید کی خوشیوں کی یاد دلا گیا۔ تمام کہانیاں اور نظمیں دل چسپ اور معیاری تھیں۔ (عامر سلیمان مراد، سیال کوٹ)

تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے بچوں کا بہترین رسالہ ہے۔ خدا اس کو مزید ترقی دے آمین (سید غفور علی شاہ، اسلام پورہ لاہور)

میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ ایک بہت اچھا اور خوب صورت رسالہ ہے۔ اور غالباً" پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بھی بہت دل چسپ اور خوب صورت تھا۔ (حافظ نعیم احمد، جھنگ شہر)

تعلیم و تربیت ہم سب بہن بھائیوں کا محبوب رسالہ ہے۔ اس کی تمام کہانیاں دل چسپ اور سبق آموز ہوتی ہیں۔ اس رسالہ میں درس قرآن، باتیں بڑوں کی، دلچسپ اور عجیب اور قدرت کے عجوبے بہت اچھے سلسلے ہیں۔ (راجا کامران مطلوب احمد خان پوٹھوہاری، راول پنڈی)

مارچ کا رسالہ ملا تو افسوس کہ عید باسی ہو چکی تھی۔ لہٰذا میری طرف سے بھی آپ کو باسی عید مبارک ہو۔ رسالے کا سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیاں بھی سب ہی عمدہ تھیں۔ (صائمہ سعید، سمن آباد لاہور)

ان ساتھیوں کے خط جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکے۔ راشد منہاس ثاقب پر بجلاں۔ ملک محمد فرحت کمال خان نیازی کامرہ۔ عینی فیصل آباد۔ فضل الٰہی چودھری رکن۔ سائرہ نسیم۔ احمد صہیب عمران کوہاٹ۔ محمد شہباز علی بگا لوہیانوالہ۔ سیدہ تہمینہ فاطمہ رحیم یار خان۔ محمد یونس فیصل آباد۔ شہزاد طارق تخلیق گوہڑ چک 8۔ عزیز الرحمان عرف قاری شیخوپورہ۔ راجہ نعمت اللہ شاہین گدو بیراج۔ مدیحہ رفیق لاہور۔ سلطان جلال الدین فیصل سلطان باہو۔ محمد اشرف بھٹی ملور جہلم۔ اشفاق فرید خانیوال۔ وجاہت احمد روال پنڈی۔ سید شفیق عالم شاہ ٹھٹھہ۔ ناصر فیاض پشاور۔ عرفان رشید احمد بٹ سرائے عالم گیر۔ ساجد حسین نوری آباد۔ عمران رشید احمد بٹ سرائے عالم گیر۔ خواجہ انجم نثار سرائے عالم گیر۔ جہاں زوہیب علی سرائے عالم گیر۔ بدر الزمان سیال کوٹ۔ عبدالرحیم خانپور۔ ثمرین اقبال مصار شریف۔

باتیں بڑوں کی

مرسلہ : انجم سہیل مغل' اوکاڑہ

☆ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے۔ (حدیث نبوی)

☆ معافی بہت اچھا انتقام ہے۔ (حضرت علیؓ)

مرسلہ : آمنہ شاہد گلزار احمد' لاہور

☆ جو اللہ کا وفادار نہیں' وہ کسی کا وفادار نہیں۔ (امام غزالیؒ)

مرسلہ : حمیرا شریف' مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

☆ کبھی اس چیز کے لئے آنسو مت بہاؤ' جو تمہارے لئے آنسو نہیں بہا سکتی۔ (خلیل جبران)

مرسلہ : محمد عدیل دانش' لانڈھی کراچی

☆ کسی کو کچھ دینے میں جو بات ہے' وہ کسی سے لینے میں نہیں۔ (حافظ شیرازی)

مرسلہ : یاسر نثار' سرگودھا

☆ امن چاہتے ہو تو کان اور آنکھ استعمال کرو۔ زبان بند رکھو۔ (ہربرٹ اسپنسر)

مرسلہ : محمد رضوان فاروق' منڈی بہاء الدین

☆ زندوں کو خیرات کی ضرورت مُردوں سے زیادہ ہے۔ (جارج آرنلڈ)

مرسلہ : اویس احمد' ون یونٹ کالونی بہاول پور

☆ غریب کو صدقہ دینے سے صرف صدقے کا ثواب ملتا ہے' اور غریب رشتے دار کو صدقہ دینے سے دگنا ثواب ملتا ہے۔ ایک صدقے کا' اور دوسرا رشتے داری کا حق ادا کرنے کا (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

مرسلہ : محمد مشتاق' رحمان آباد کراچی

☆ جو آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے' وہ جاہل ہے' اور جو اپنے آپ کو جنتی کہے' وہ جہنمی ہے (حضرت عمر فاروقؓ)

☆ باپ منہ موڑ سکتا ہے' بھائی دشمن بن سکتا ہے' میاں بیوی میں عداوت پیدا ہو سکتی ہے' لیکن ماں کی محبت کبھی کم نہیں ہو سکتی (نامعلوم)

☆ غریب مہمان آ جائے تو قرض لے کر بھی اُسے کھانا کھلاؤ۔ (حضرت غوث الاعظمؒ)

مرسلہ : حافظ مجیداللہ عزیز' شاہ درہ لاہور

☆ عقل مند سوچ کر بولتا ہے اور بے عقل بول کر سوچتا ہے (نامعلوم)

مرسلہ : مسعود احمد سومرو' گڈو بیراج

☆ دوست ہزار بھی کم ہیں' اور دشمن ایک بھی بہت ہے۔ (نصیر الدین طوسی)

☆ جو بُرے کام سے ڈرے' وہ سب سے بڑا بہادر ہے۔ (کارلائل)

مرسلہ : عاقب علی' بلال ٹاؤن جہلم

☆ جو شخص تم سے دوسروں کی بُرائی کرتا ہے' وہ یقیناً دوسروں سے تمہاری برائی بھی کرتا ہوگا۔ (حسن بصریؒ)

☆ زیادہ قسمیں کھانے والا زیادہ جھوٹ بولتا ہے۔ (مولانا رومؒ)

مرسلہ : عزیز الرحمان' عرف قاری' شیخوپورہ

☆ دولت کے بھوکے کو کبھی سکون نصیب نہیں ہو سکا (معروف کرخیؒ)

☆ کوئی کیسا ہی اچھا ہو' بُروں کی صحبت اُسے بُرا بنا دیتی ہے۔ (معین الدین چشتیؒ)

مرسلہ : احمد فہیم' لاہور

☆ ہمیشہ اُس بادل کی طرح لوگوں پر منڈلاؤ جو پھولوں کے ساتھ کانٹوں پر بھی برستے ہیں۔ (نامعلوم)

تیرا میرا پاکستان

تیرا میرا پاکستان
تیرا میرا پاکستان

سب دیسوں سے پیارا ہے
جگ مگ کرتا تارا ہے
خوشیوں کا گہوارا ہے
تیرا میرا پاکستان
تیرا میرا پاکستان

گلشن ہے خوش بوؤں کا
مہکے مہکے پھولوں کا
رنگ برنگے پھولوں کا
تیرا میرا پاکستان
تیرا میرا پاکستان

ہر دم یہ آزاد رہے
تابندہ اور شاد رہے
شاد رہے، آباد رہے
تیرا میرا پاکستان
تیرا میرا پاکستان

اجمل وجیہہ

جادو نگری

حنا تیزی

بچپن سے سُنتے آئے تھے کہ والٹ ڈزنی نے امریکا میں ایک جادو نگری بنائی ہے جسے ڈزنی لینڈ کہتے ہیں۔ اِس جادو نگری کی داستانیں سُن سُن کر ہمارا دل مچل اُٹھتا تھا کہ ہم بھی جادو کے اِس دیس میں اُڑ کے پہنچ جائیں' اور وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھیں جو ساری دنیا کے لئے ایک عجوبہ ہے۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ہم کہاں اور ڈزنی لینڈ کہاں۔ ہم یہاں' اِتنی دُور' پاکستان میں بیٹھے ہیں اور ڈزنی لینڈ دُنیا کے اُس کونے پر ہے۔ بھلا ہم وہاں کہاں جائیں گے!

یہ خواہش ایک خواب بن کے دل کے کسی گوشے میں دفن ہو گئی اور برسوں بعد جب ہم اپنی شادی کے بعد امریکا پہنچے اور ہمارے شوہر' کمال' نے ہمیں ڈزنی لینڈ دکھانے کو کہا تو برسوں پُرانی' بُھولی بھٹکی' خواہش کے پورا ہونے کے خیال سے ہم مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

والٹ ڈزنی
رنگی ماؤس کے ساتھ

والٹ ڈزنی نے سب سے پہلے' جولائی 1955ء میں' اینا ہائم (کیلی فورنیا) کے مقام پر ڈزنی لینڈ بنایا۔ اِس کے بعد' اکتوبر 1971ء میں' آرلینڈو (فلوریڈا) کے مقام پر ڈزنی ورلڈ کی بُنیاد رکھی گئی۔ یہ ڈزنی لینڈ کے مقابلے میں بہت لمبے چوڑے رقبے پر پھیلا ہوا ہے' اور یہاں دل چسپی کے وہ نئے سامان بھی ہیں جو ڈزنی لینڈ میں نہیں ہیں۔ ڈزنی لینڈ میں صرف میجک کنگ ڈم (جادو نگری) ہے' جب کہ ڈزنی ورلڈ (یعنی ڈزنی کی دنیا) میں میجک کنگ ڈم کے علاوہ ایپ کورٹ سینٹر اور ایم جی ایم فلم اسٹوڈیو بھی ہیں۔

آرلینڈو بڑا ہرا بھرا شہر ہے۔ یہاں کا موسم کراچی کی طرح کا ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی پڑتی ہے اور سردیاں خاصی خوش گوار ہوتی ہیں۔ اِس لئے' بہت سوچ سمجھ کے ڈزنی نے یہاں یہ خوب صورت اور انوکھی دنیا بسائی ہے تاکہ سارا سال سیّاح آسکیں۔

ڈزنی ورلڈ جانے کا راستہ بہت سر سبز ہے۔ یہاں' میلوں تک' زمین خالی پڑی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ خالی زمین ڈزنی کی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ آس پاس کے سارے علاقے خرید رہا ہے' تاکہ ڈزنی ورلڈ کو اور بڑھایا جا سکے۔ یہاں ڈزنی نے کئی شان دار ہوٹل اور خوب صورت پارک بنائے ہیں۔ اِن میں تین واٹر پارک یعنی پانی کے پارک ہیں۔

بس جگہ ہم پہنچے وہاں سے تینوں جگہوں کے ٹکٹ ملتے تھے۔ ٹکٹ گھر کے باہر لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ کچھ سیزنل ٹکٹ کی قطاریں تھیں اور کچھ روزانہ کے ٹکٹوں کی۔ ڈزنی ورلڈ کا ٹکٹ بہت مہنگا ہے، یعنی ایک دن کا 35 ڈالر۔ اِس کے علاوہ چار دن کا ایک پاس ملتا ہے، جس کی قیمت 120 ڈالر ہے، اور 5 دن کے پاس (یعنی سُپر پاس) کی قیمت 180 ڈالر ہے۔ کمال ٹکٹ لے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں ٹہوکا دیا اور بولے "چلو، جلدی کرو ورنہ ٹرام چل دے گی"۔ ہمارے سامنے ایک ٹرام کھڑی تھی، جس میں لوگ سوار ہو رہے تھے۔ ہم بھی جلدی سے سوار ہو گئے۔

ڈزنی ورلڈ کے اندر داخل ہوتے ہی ہمارا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ اب ہم چند ہی لمحوں میں اِس عجیب و غریب دنیا کی سیر کرنے والے تھے کہ اچانک اوپر کچھ شور سا سنائی دیا۔ ایک پٹری پر چلنے والی ایک نازک سی ٹرین ہمارے سامنے آ کر رُک گئی تھی۔

"یہ کیا۔۔۔؟" ہمارے مُنہ سے نکلا۔ کمال نے بتایا کہ یہ مونو ریل ہے، جو لوگوں کو میجک کنگڈم اور ایپ کورٹ سینٹر لاتی لے جاتی ہے۔ مگر ہم فیری یعنی

مسافر کشتی کے ذریعے میجک کنگڈم جائیں گے۔

"میجک کنگڈم۔۔۔؟" ہم نے اچنبھے سے پوچھا "تو کیا یہ میجک کنگڈم نہیں ہے؟"

"نہیں۔ وہ دیکھو۔ پانی کے اُس پار جو زمین دکھائی دے رہی ہے، وہی میجک کنگڈم ہے، اور ہم وہاں اِس فیری کے ذریعے جائیں گے"۔

ہم فیری کی طرف تیز تیز قدم اُٹھانے لگے۔ اور بہت سے لوگ بھی اُس کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لوگ مونو ریل کی جانب جاتے اور وہاں سے آتے دکھائی دیے۔ ہم نے کمال سے پوچھا "میجک کنگڈم صرف فیری ہی میں جاتے ہیں؟" کمال نے بتایا کہ بس اور مونوریل سے بھی جاتے ہیں۔ ہم واپسی میں اِن میں سے کسی سے آئیں گے۔

سفید رنگ کی خوب صورت فیری اپنے اندر بہت سے لوگوں کو سمیٹ رہی تھی۔ ہم دونوں بھی اندر جا کر کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد فیری نے آہستہ آہستہ حرکت شروع کی اور چند ہی منٹ میں ہم میجک کنگڈم کے کنارے پر اُتر گئے۔ ہر طرف سے لوگ بسوں، فیری اور مونوریل میں سے نکل نکل کر میجک کنگڈم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہم بھی اپنا ٹکٹ دکھا کر اندر داخل ہوئے تو سامنے ریل ہال کی خوب صورت عمارت اور نیچے گھاس پر گھاس ہی سے بنی ہوئی رنگین ماؤس کی صورت کی، گھڑی نظر آئی۔ اُس کے اِردگرد ڈزنی کے

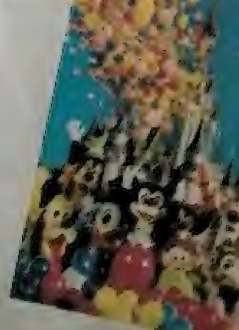

بنائے ہوئے کارٹونوں کے کئی کردار گھومتے دکھائی دیئے۔ بچّے انھیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے اور اُن کے ساتھ نہ صرف اپنی تصویریں اُتروا رہے تھے بلکہ اُن سے آٹو گراف بھی لے رہے تھے۔

یہاں سے ہم "مین اِسٹریٹ یُو ایس اے" میں داخل ہوئے۔ اندر جاتے ہی یوں لگا جیسے کسی پُرانے زمانے میں چلے آئے ہوں۔ اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں۔ چاروں طرف پُرانی طرز کے مکان اور دکانیں۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خوب صورت بگھی بھی تھی جس میں لوگ سیر کر رہے تھے اور جسے ایک بہت ہی تن دُرست اور گراں ڈیل گھوڑا کھینچ رہا تھا۔ اِس اِسٹریٹ یا گلی کو اُس زمانے کی اِسٹریٹ کے نمونے پر تیّار کیا گیا تھا، جس زمانے میں ڈِزنی لینڈ بنا تھا۔ یہیں سے میجک کِنگڈم کا سفر شروع ہوتا ہے اور یہیں پر ختم ہوتا ہے۔

مین اِسٹریٹ کا موڑ کاٹا ہی تھا کہ ہم ششدر رہ گئے۔ ہمارے سامنے سِنڈریلا کا قلعہ یا محل کھڑا آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ ہم نے تصویروں اور فلموں میں یہ قلعہ دیکھا تھا۔ اِس وقت اُس کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور یقین آگیا کہ ہم واقعی ڈزنی ورلڈ کی سیر کر رہے ہیں۔ یہ قلعہ ڈزنی ورلڈ کی پہچان ہے۔

سِنڈریلا کا یہ قلعہ 189 فٹ بلند ہے اور اِس کی عمارت میں سونا اور چاندی بھی اِستعمال کی گئی ہے۔ پہلے ہم سمجھ رہے تھے کہ یہاں بھی کوئی دیکھنے کی جگہ ہو گی، لیکن معلوم ہوا کہ یہاں زمین کے نیچے کمرے وغیرہ ہیں جن سے نہ صرف ڈزنی ورلڈ کی بہت سی چیزوں کا نظام چلایا جاتا ہے بلکہ سیکورٹی کے کمرے، یہاں کام کرنے والے لوگوں کے تیّار ہونے کی جگہیں اور براڈ کاسٹنگ کے اِنتظامات کے علاوہ کِنگ اسٹیفنز ہال میں ڈزنی کے کرداروں کے ساتھ ناشتا، لنچ اور ڈنر بھی کیا جاتا ہے۔

اِردگرد کھلونوں، کتابوں، کیمروں اور مختلف قسم کی سوغات کی دکانیں اور ریسٹوران تھے۔ اِن دکانوں میں ڈزنی ورلڈ سے متعلق اشیا تھیں، مثلاً "ٹی شرٹیں جن پر مکی ماؤس اور دوسرے کرداروں اور سِنڈریلا کے قلعے کی تصویریں بنی تھیں۔ اِن کے عِلاوہ کی چین، وڈیو اور آڈیو کیسٹ، ہیٹ، مگ، پنسلیں، تولیے، پین، ٹوپیاں، ڈیکوریشن کی اشیا، بُھس بھرے جانور وغیرہ بھی تھے۔ لوگ اِن دکانوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ یہی حال اِسنیک بار اور ریسٹورانوں کا تھا۔ کافی، چائے، ٹھنڈے مشروبات، آئس کریم کے عِلاوہ سینڈوچ، چپس اور دوسری چیزیں دھڑا دھڑ فروخت ہو رہی تھیں۔

"چلو، یہ بعد میں دیکھ لینا۔ پہلے یہ طے کرنا ہے کہ چلنا کہاں ہے۔" کمال نے کہا اور ڈزنی ورلڈ کے گائڈ اور نقشے دیکھنے لگے۔ ہر ٹکٹ کے ساتھ یہاں کی گائڈ بھی ملتی ہے جس میں یہاں موجود تمام جگہوں، دکانوں، ریسٹورانوں اور باتھ رومز کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ نقشہ بھی مہیّا کیا جاتا ہے جس کی مدد سے آسانی سے سیّاح گھومتے پھرتے ہیں اور ذرا بھی پریشان نہیں ہوتے۔ ڈزنی ورلڈ میں لوگوں کی سیر کے لئے مختلف سواریاں رکھی گئی ہیں۔ جیسے وہ خوبصورت بگھی جو ہم

نے یہاں آتے ہی دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ فائر ٹرک' پرانے زمانے کی گاڑیاں' ڈبل ڈیکر بسیں اور ریل گاڑی۔ باقی سواریاں ایک مخصوص جگہ سے آگے نہیں جاتیں۔ ان کے مخصوص اسٹاپ ہوتے ہیں' جب کہ ریل گاڑی میں بیٹھ کے نہ صرف تھکن دور کی جا سکتی ہے بلکہ سارے میجک کنگڈم کی سیر کی جا سکتی ہے۔ اس میں کل 15 منٹ لگتے ہیں۔ ریل گاڑی کے اسٹاپ مین اسٹریٹ کے علاوہ فرنٹیئر لینڈ اور ریڈ اسٹار لینڈ ہیں۔ فینٹسی لینڈ سے ٹومارو لینڈ تک کیبل کار یا اسکائی وے بھی چلتی ہے۔ یہ صرف ون وے ہے اور اس میں بیٹھ کے اوپر سے میجک کنگڈم کا نظارہ کیا جاتا ہے۔

ہمارے سیدھے ہاتھ پر ٹومارو لینڈ کی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ ہم بائیں طرف مڑ گئے۔ میجک کنگڈم میں مختلف قسم کے لینڈ بنائے گئے ہیں۔ ہر لینڈ میں ریسٹوران' دکانیں اور دل چسپی کی دوسری چیزیں ہیں' جیسے ایڈونچر لینڈ' فرنٹیئر لینڈ' لبرٹی اسکوائر' فینٹسی لینڈ' ریڈ اسٹار لینڈ اور ٹومارو لینڈ۔ ایک طرف ایک بڑا سا بورڈ لگا تھا جس پر ایڈونچر لینڈ لکھا تھا۔ یہ بتا رہا تھا کہ یہاں سے ایڈونچر لینڈ کی حد شروع ہوتی ہے۔ ایڈونچر لینڈ کے اندر داخل ہو کر ہم نے اپنی پیاس "پینا کولاڈا" سے بجھائی۔ یہ اناناس اور ناریل کا فرحت بخش مشروب ہے۔ ہمارے سامنے ایک بہت موٹا اور اونچا درخت تھا۔ یہ سوئس فیملی ٹری ہاؤس تھا۔ اسے مشہور کتاب سوئس فیملی رابنسن کے ٹری ہاؤس کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت ہی پرانا درخت ہے۔ ہم اسے دیکھتے ہی اچنبھے میں پڑ گئے کہ یہ اصلی درخت ہے یا نقلی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ یہ کسی طور اصل نہیں ہو سکتا۔ درخت پر دو تین منزلہ مچانیں بنائی گئی تھیں جن میں چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ درخت اور جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک چشمہ بہ رہا تھا۔ اس کے کنارے ایک پتیا گھوم رہا تھا اور ساتھ ہی رسّی سے بندھے ڈرم اوپر جا رہے تھے۔ اس سے یہ بتایا گیا تھا کہ سوئس فیملی نے پانی اوپر چڑھانے کا ایسا انتظام کیا تھا۔

درخت پر چڑھنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں اور لوگوں کی ایک قطار اوپر جا رہی تھی۔ ہم بھی اس قطار میں شامل ہو کر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اوپر ایک ننھے منّے کمرے میں میز کرسی کے علاوہ چند کتابیں' موم بتیاں اور قلم وغیرہ بھی رکھے تھے۔ ایک الماری میں استعمال کے برتن سلیقے سے رکھے تھے۔ روز مرّہ کے استعمال کی کچھ اور چیزیں بھی تھیں۔ دوسری طرف نیچے تو ایک چھوٹا سا بیڈروم دیکھا۔ اس میں چھوٹا سا بستر' رضائیاں' سنگھار میز اور کرسیاں وغیرہ پڑی تھیں۔ اس کے اوپر ایک اور کمرا تھا جس میں میلے کپڑے دھلنے کے لئے پڑے تھے۔ درخت کیا تھا' ایک پورا مکان تھا۔ دوسری طرف سیڑھیاں اتر کر تھوڑا نیچے پہنچے تو پورا باورچی خانہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا۔ کھانے پینے کی ضروری اشیا' برتن' پھل' سبزیاں سب کچھ موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ پھل اور سبزیاں اصلی نہیں تھیں۔ لیکن دیکھنے میں اصلی ہی لگ رہی تھیں۔ کھانے کی میز پر پلیٹیں' چمچے' کانٹے لگے ہوئے تھے۔ چولھا بھی تھا۔ بوریوں میں اناج رکھا تھا۔ غرض سوئس فیملی کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی' ہوائے وہاں رہنے والے لوگوں

کے۔ اس درخت کی تیاری میں 300,000 پلاسٹک کے پتے استعمال کیے گئے اور اس کی کنکریٹ کی جڑیں 42 فٹ زمین کے اندر گڑی ہیں۔

یہاں سے نکل کر ہم جنگل کروز یعنی جنگل کا بحری سفر کی قطار میں لگ گئے۔ قطار تھی تو کافی لمبی لیکن ایک ہی جگہ رُکی ہوئی نہیں تھی۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ لوگوں میں کس قدر نظم و ضبط تھا۔ نہ کسی قسم کی دھکم پیل، نہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش۔ بڑے آرام اور سکون سے نہ صرف بڑے بلکہ بچے بھی کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ یہ نظم و ضبط اُن کو اسکولوں میں سکھایا جاتا ہے۔ لوگوں کو انتظار کی کوفت سے بچانے اور ان کی دل چسپی کا سامان پیدا کرنے کے لئے مختلف قسم کی چیزیں رکھی گئی تھیں تاکہ لوگوں کا دھیان بٹا رہے، جیسے پُرانے صندوق، بندوقیں، پانی کی چھاگلیں، ہاتھی دانت اور اسی قسم کی دوسری اشیا۔

پانی پر تیرتی کشتیاں کنارے پر آ کے لگتیں اور لوگ اُن میں سوار ہونے لگتے۔ جب ہماری باری آئی تو ہم بھی ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ ہمارے ساتھ تقریباً دس بارہ لوگ ہوں گے۔ ہر کشتی کو ایک گائڈ چلا رہا تھا۔ ہمارے دونوں طرف گھنے درخت اور جھاڑیاں تھیں اور ہماری کشتی پانی کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ ہمیں دراصل کشتی کے ذریعے افریقہ کے جنگلوں کی سیر کرائی جا رہی تھی۔ ہمارے گائڈ نے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ وہ کہہ رہا تھا: خواتین و حضرات! ہم سب اس وقت افریقہ میں ہیں اور دریائے کانگو میں سفر کر رہے ہیں۔ یہاں آپ کو کئی خطروں کا سامنا ہوگا اور آپ کا واسطہ خوں خوار درندوں سے بھی پڑے گا۔ لہٰذا پورے چوکس رہیے۔ کہیں بے خبری میں کوئی درندہ آپ پر حملہ نہ کر دے۔

ہم سمجھ تو رہے تھے کہ وہ یہ باتیں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے کر رہا ہے، پھر بھی دل پر ایک ان جانا سا خوف طاری تھا۔ جوں ہی کشتی نے ایک موڑ کاٹا، ایک بڑا سا اژدھا مُنہ کھولے ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھی ہوئی عورتوں کے مُنہ سے چیخیں نکل گئیں۔

آگے بڑھے تو ہاتھی کی چنگھاڑ سُنائی دی، اور پھر جھاڑیوں میں کھڑا ہاتھی دکھائی دیا جس کے بڑے بڑے کان پنکھے کی طرح ہل رہے تھے۔ اور آگے بڑھے تو کنارے پر جنگلیوں کی بڑی خوب صورت کشتیاں اور اُن کے نیزے اور بھالے رکھے دکھائی دیے۔ ایک جگہ گوریلوں کا ایک پورا خاندان موجود تھا۔ پاس ہی ایک جیپ اُلٹی پڑی تھی اور کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گوریلوں نے کسی کی جیپ پر حملہ کیا ہو۔ ہماری کشتی اور آگے بڑھی تو کنارے پر زرافے، زیبرے، ہرن اور نیل گائے کھڑے دکھائی دیے۔ اور آگے بڑھے تو ببر شیر اور اس کی بیوی بچے ایک زیبرے کو کھا رہے تھے، اور پاس ہی درخت پر چند گدھ بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

اس کے بعد ہماری کشتی ایک پُرانے ڈوبے ہوئے مندر میں داخل ہو گئی۔ یہ ایک لمبا چوڑا غار تھا جس میں ہر طرف گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ

سُجھائی نہیں دے رہا تھا۔ رہی سہی کسر شیر کی دھاڑ نے پوری کر دی۔ ہمارا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ پل بھر کو ایسا لگا جیسے اندھیرے میں شیر ہمارے اُوپر چھلانگ لگانے لگا ہے۔ ہماری آنکھیں اندھیرے سے ذرا مانوس ہوئیں تو ہمیں وہ شیر دکھائی دیا جس نے ہمیں دہلا دیا تھا۔ وہ ایک چٹان پر بڑی شان سے کھڑا تھا اور اُس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔

آخر روشنی کی ایک جگ مگاتی کرن نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تین چار ہاتھی پانی میں ڈبکیاں لگا رہے ہیں اور اپنی سونڈوں سے ایک دوسرے پر پانی بھی پھینک رہے ہیں۔ ان کے علاوہ دریائی گھوڑے بھی تھے۔ غرض ہر طرف کوئی نہ کوئی عجیب و غریب چیز موجود تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دائیں طرف دیکھیں یا بائیں طرف۔ ایک منظر کو دل میں اُتار نہیں پا رہے تھے کہ دوسرا آ موجود ہوتا۔ ایک طرف، کنارے پر، دو آدمی ڈر کے مارے درخت پر چڑھے ہوئے تھے اور نیچے کھڑا ایک گینڈا اور لگڑ بگا بار بار ان کی طرف لپکتا تھا۔ قریب ہی ریت پر دو مگرمچھ بھاڑ سا منہ کھولے پانی میں اُترنے کو تیار تھے۔ اُن کے مُنہ کبھی کھلتے، کبھی بند ہوتے۔

ہماری کشتی ایک آب شار کے پیچھے سے گزری تو معلوم ہوا کہ آبشار کے پیچھے کا منظر کیسا لگتا ہے۔ سامنے سے تو خوب صورت لگتا ہی ہے، پیچھے سے بھی حسین لگتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے پانی کی ایک چادر سی گر رہی ہے۔ اس سارے سفر میں ہم دونوں نے کچھ تصویریں بھی اُتاریں۔ ہمارا گائڈ مسلسل کمنٹری کر رہا تھا۔ جگہ جگہ ہمیں جنگلیوں کی جھونپڑیاں دکھائی دیں۔ ایک جگہ بہت سے جنگلی ناچ رہے تھے۔ اور پھر ایک موڑ کاٹتے ہی ہمارا دل دھک سے رہ گیا۔ ہمارے بالکل قریب ہی ایک جنگلی، چھتری تانے، عجیب و غریب حلیے میں کھڑا تھا۔ اُس نے اپنے گلے میں بندر کی کھوپڑی لٹکائی ہوئی تھی۔ آخر کار ہماری یہ دل چسپ اور تفریح سے بھرپور سیر ختم ہوئی۔ ہمیں افریقہ کے جنگل کا بڑا ہی انوکھا اور اچھوتا تجربہ ہوا تھا۔

"کیوں بھئی، کیسی لگی یہ سیر؟" کمال نے پوچھا۔

"بہت مزے دار" میں نے کہا "لیکن اتنی جلدی ختم بھی ہو گئی"۔ (باقی اگلے مہینے)

بحر

بحر نمکین پانی کے اُس بہت بڑے رقبے کو کہتے ہیں جو زمین کی سطح کے 72 فی صد حصّے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اِس کا پانی ہمیشہ گردش میں رہتا ہے (جس طرح ہمارے جسم میں خون گردش کرتا رہتا ہے)۔ یہ دو ملکوں یا بڑا عظموں کے درمیان سرحد کا کام بھی دیتا ہے' اور کسی علاقے کے موسم اور آب و ہوا پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

دیکھا جائے تو پانی کا یہ بہت بڑا رقبہ ایک ہی بحر ہے' لیکن جغرافیہ دانوں نے' اپنی سہولت کے لئے' اِسے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ اِن حصّوں کے نام یہ ہیں : (1) بحرالکاہل (پیسی فِک)' (2) اوقیانوس (اٹلانٹک)' (3) بحرِ ہند (انڈین اوشن)' (4) بحرِ منجمدِ شمالی (آرک ٹک)' (5) بحرِ منجمدِ جنوبی (انٹارک ٹک)۔ اِن میں بحرالکاہل سب سے بڑا بحر ہے۔ بحر سے چھوٹے سمندر کو خُلیج یا خلیج کہتے ہیں' اور یہ کثیر تعداد میں ہیں۔

بحر ساحل کے قریب زیادہ گہرا نہیں ہوتا۔ اِس کی گہرائی آہستہ آہستہ بڑھتی ہے۔ 600 فٹ گہرائی تک کے بحر بڑی زیرِ آب کہلاتے ہیں۔ بڑی زیرِ آب کے بعد بحر کی یہ ایک دم ڈھلواں ہو جاتی ہے۔ اِسے بڑی ڈھلان کہتے ہیں۔ بحر میں کہیں کہیں گہرے غار بھی پائے جاتے ہیں' جو بحری خُلق کہلاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا بحری خُلق یا غار بحرالکاہل میں' جزائرِ فلپائن کے قریب ہے۔

گہرے بحر کا پانی سبزی مائل نیلا ہوتا ہے' اور اِس کے ہر 100 پونڈ پانی میں 3 پونڈ نمک پایا جاتا ہے۔ بحروں میں قسم قسم کے چھوٹے بڑے جانور اور پودے کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اگر خشکی پر تمام خوراک ختم ہو جائے تو سمندروں میں اِتنی خوراک موجود ہے کہ انسان لاکھوں سال تک اِسے اِستعمال کر سکتا ہے۔ خوراک کے عِلاوہ سمندروں میں قیمتی معدنیات (پیٹرول' کوئلا' قُدرتی گیس' ہیرے جواہرات اور نمک) کے ذخیرے بھی کافی تعداد میں موجود ہیں' اور ترقی یافتہ قومیں اِن سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔

ہونہار فوٹوگرافر

انداز اپنا اپنا
پہلا انعام: 400 روپے کی کتابیں
میر عدیل پرویز، مظفر آباد

گوریلا میرا ساتھی
دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں
راجہ طارق بٹ، راول پنڈی چھاؤنی

گجرو پنجاب کا
تیسرا انعام: 70 روپے کی کتابیں
جان محمد بٹ، ملتان روڈ لاہور

نئی بہار
چوتھا انعام: 55 روپے کی کتابیں
شعیب حبیب، صادق آباد

ہدایات

تصویر رنگین اور پوسٹ کارڈ سائز کی ہونی چاہیے۔ موضوع کوئی قید نہیں۔ اس مقابلے میں 16 سال تک کے ساتھی حصّہ لے سکتے ہیں۔ تصویر کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔

کوپن

ہونہار فوٹوگرافر

نام _____ عمر _____

پتا _____

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
R.L.NO.4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

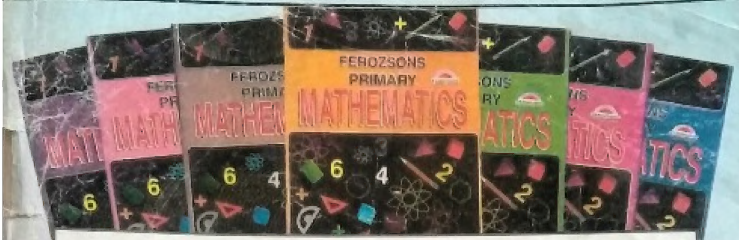

FEROZSONS PRIMARY MATHEMATICS

* Attractively designed to capture the young child's attention and arouse his inquisitive interest.
* Extravagant use of richly coloured illustrations to complement the text and to sustain the child's interest.
* Easy-to-follow text which aims at developing a friendliness with the fundamentals of mathematics.
* Concept-oriented, with special emphasis on skill development.
* Suggestions and guide-lines for parents and teachers to facilitate easy teaching.

Intro a	969 0 10152 8	**1a**	969 0 10156 0	**1b**	969 0 10157 9
Intro b	969 0 10153 6	**2a**	969 0 10158 7	**2b**	969 0 10159 5
Intro c	969 0 10154 4	**3a**	969 0 10160 9	**3b**	969 0 10161 7
Intro d	969 0 10155 2	**4a**	969 0 10162 5	**4b**	969 0 10163 3
		5a	969 0 10164 1	**5b**	969 0 10165 X

FEROZSONS (Pvt) LTD.
RAWALPINDI - LAHORE - KARACHI

Lahore: 60, Shahrah-e-Quaid-e-Azam, Lahore, Phones: 6301196-97-98
Fax: 042-6369204
Rawalpindi: 277, Peshawar Road, Rawalpindi, Phones: 563503-564273
Fax: 051-564273
Karachi: 1st Floor, Mehran Heights, Main Clifton Road, Karachi,
Phones: 5830467,5865205,5867239 Fax: 021-570534